بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۳ ——— شمارہ نمبر ۱۳

جنوری ۱۹۸۹ء

• مدیر مسئول ——— نور محمد فلاحی

• مرتب ——— ولی اللہ سعیدی فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

• سالانہ تعاون .... ۳۰ روپئے
• خصوصی تعاون .... ۱۰۰ روپئے
• غیر ممالک سے .... ۱۵ امریکی ڈالر
• فی شمارہ .... ۳ روپئے

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ "حیات نو" جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضر نعیمی پبلشر پرنٹر نے حالی پریس دہلی ...... کاتب: رفیق احمد شاہ پور، محمد پور، اعظم گڑھ

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے "ملیہ اسلامیہ" پر ایک ضرب کاری	محمد اسمٰعیل فلاحی	۳

مقالات

یہ جہاد نہیں خودکشی ہے	ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی	۷
قرآن کا تصورِ علم	ڈاکٹر سید مسعود احمد صاحب	۲۰
زبان و ادب کی ترقی میں قرآن کا رول	توقیر عالم فلاحی	۳۶

عظمت کے مینار

عدی بن حاتم طائی رضہ	ابو جاوید	۴۵

نشریاتِ انجمن

رپورٹ اجلاس شوریٰ انجمن طلبۂ قدیم	جاوید اشرف فلاحی	۳۳

وفیات

دار العلوم ندوۃ العلماء کو ایک سانحہ	ادارہ	۴۳

شعر و نغمہ

نعت و نظم	قمر سنبھلی، شیخ منقصت مبارکپوری، عزیز بگھروی	۴۳-۴۵-۳۳
دورِ جدید کے مسائل اور ان کا حل	عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز۔ عبد الرزاق عفیفی عبد اللہ بن قعود۔ عبد اللہ بن غدیان	۴۸

تاریخ کے جھروکوں سے

جمال عبد الناصر کے سیاسی خفیہ گوشے	الاستاذ عمر بہاء الدین الامیری	۱۶

حلقۂ یاراں

عبد الحمید اصلاحی، محمد قمر الدین قمر، آفتاب رحمانی، محمد الیاس اعظمی		۵۲

اخبارِ علمیہ

آکسفورڈ یونیورسٹی کیلئے عالمی پیمانے پر چندہ	عبد الرحمان عرفی ششم	۵۵

جامعہ کے لیل و نہار

امیر جماعت کا اساتذۂ جامعہ سے خطاب	محمد اسمٰعیل فلاحی	۵۸

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے "ملیہ اسلامیہ" پر ایک ضرب کاری

کسی قوم کو دولت، وقتی کے تعاون میں ڈھکیل دینا ہو تو اس سے علم و تحقیق کی کنجیاں چھین لیجیے۔ اسلئے کہ دنیا میں وہی قوم آگے بڑھتی ہے جس کے خزانے علم و تحقیق سے معمور ہوں اور جسے اپنے عقیدہ و مسلک کا سچا شعور اور ان سے گہری عقیدت و محبت ہو۔ ہندوستان میں جب انگریزوں نے مسلمانوں کو اقتدار سے بے دخل کیا تو علم و تحقیق کے میدان میں انگریزوں کا مسلمانوں کے علاوہ کوئی دوسرا حریف اور مد مقابل نہیں تھا۔

انگریزوں نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ علم و تحقیق کے مراکز پر قبضہ کر کے جگہ جگہ اپنے ادارے قائم کئے اور ایسا نظامِ تعلیم رائج کیا جس میں اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ اس ملت کا رشتہ اس کے دین اور اس کے ماضی سے باقی نہ رہ سکے یا کم از کم کمزور پڑ جائے اور ان کی پسند کے مطابق حکومت کے کل پرزے تیار ہو سکیں۔

ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی قوم آگے بڑھ کر اقتدار پر قبضہ کرتی ہے تو شروع میں لوگوں کو اپنی سنگینوں کے آگے جھکنے پر مجبور کرتی ہے لیکن جب اقتدار طویل ہو جاتا ہے تو صرف نفرت کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں بلکہ ذہن و فکر اور دل و دماغ بھی غلام بن جاتے ہیں اور پھر جسمانی غلامی کی زنجیروں کو تو توڑا جا سکتا ہے لیکن ذہنی غلامی کی زنجیریں آسانی سے نہیں ٹوٹتیں۔

انگریزوں کے معاملہ میں یہی ہوا، قوم کے جوانوں نے جسمانی زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں لیکن ذہن و دماغ بدستور غلام ہی رہے۔ ملک آزاد ہوا اور اقتدار عملاً اکثریت کے ہاتھ میں آیا پھر ملک کا ایک دستور بنا اور دستور میں اس بات کی ضمانت دی گئی کہ یہاں بسنے والی ہر قوم کا پرسنل لا محفوظ رہے گا، کسی کے دین، کسی کی تہذیب اور کسی کی زبان پر دست درازی نہیں ہوگی۔

ایک طرف دستور کی یہ ضمانتیں تھیں دوسری جانب آزادی کے بعد جو نظامِ تعلیم رائج کیا گیا اس میں انگریزوں کی مکمل پیروی ہوئی۔ اکثریت کی تہذیب اور اس کے کلچر اور اس کی زبان و ادب

اور اس کی دیومالائی کہانیوں سے اس کو بھر دیا گیا۔ آپ کا ایک بچہ گریجویٹ ہو جاتا ہے لیکن اسے خبر نہیں ہوتی کہ اسلام کیا ہے، اس کا نظام کیا ہے، خلفائے راشدین کون تھے اور عمرو بن العاص، عبداللہ بن زبیر اور ابن حنبل کون تھے۔ اس کے مقابلے میں اس سے سیتا کے بارے میں پوچھ لیجئے، رام کے بارے میں دریافت کر لیجئے آپ کے سامنے معلومات کا ایک دفتر کھول دے گا۔

دوسری جانب عیسائی مشنریز کے زیری پرائمری، ہائی اسکول و کالج ہیں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ وہی تثلیث کا عقیدہ اور عیسیٰ کے کفارہ بن جانے کا تصور قدم قدم پر دکھائی دیتا ہے جس سے طالب علم ہر وقت متاثر ہوتا رہتا ہے۔ ان کی ننیں خود تو باتر لباس میں ہوں گی اور آپ کی بچی کو سر پر دوپٹہ رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی یا اس کے لئے اس کو کشمکش کرنی پڑے گی۔

ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو تاکہ ان کی تعلیم و تربیت ان کے دین کے مطابق ہو، ان کی تہذیب سے ان کا رشتہ باقی رہے اور وہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے جی سکیں۔ مسلمان دینی مدارس بہت پہلے سے چلا رہے تھے جو اس سیلاب کے آگے بند کی حیثیت رکھتے تھے اور جس نے ان کو اور ان کی تہذیب کو بہت حد تک باقی رکھا تھا لیکن ان میں صرف دینی عنصر تھا اور عصری تقاضوں سے صرف نظر کیا گیا تھا۔

اس صورت حال کے پیش نظر اس صدی کی تیسری دہائی میں مسلمانوں نے اپنے تین عصری تعلیمی ادارے قائم کئے۔ ان میں سے جامعہ عثمانیہ کا آزادی کے فوراً بعد گلا گھونٹ کر اس کو اس کی تہذیبی شان سے محروم کر دیا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں مسلمانوں نے سخت مزاحمت کی جس کی وجہ سے کسی حد تک اس کا اقلیتی کردار بحال رہا۔ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تہذیبی شان پر بھی مسلسل حملے ہوتے رہے اور بالآخر جامعہ بل ۱۹۸۸ء پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے پاس ہو کر صدر جمہوریہ کے پاس ان کے دستخط کے لئے پہنچ چکا ہے جو اس جامعہ کی شہ رگ پر ایک فیصلہ کن ضرب کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی بھی ادارے کی شناخت اس کے بانیوں سے ہوتی ہے لیکن اس بل میں جامعہ کے حقیقی بانی مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں سے،

مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا کوئی تذکرہ تک نہیں۔ اس بل میں جامعہ کے اغراض و مقاصد بیان کرتے وقت اس کے ملی و اقلیتی کردار کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس میں اردو ذریعہ تعلیم کا بھی کوئی تذکرہ نہیں، حالانکہ جامعہ میں اردو کو اب تک ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ اس بل میں چانسلر اور وائس چانسلر کے اوپر ایک وزیٹر VISITOR مقرر کر کے اسے لامحدود اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ نیز اس بل کی رو سے جامعہ کی مجلس منتظمہ کی بڑی تعداد وزیٹر کے ہی منتخب کردہ افراد کی ہوگی جس کی وجہ سے جامعہ کی اندرونی خود مختاری مجروح ہو کر بلکہ کالعدم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس بل میں مذکور ایک کورٹ میں اردو والوں کو تو نمائندگی دی گئی ہے لیکن طلبائے قدیم، علمائے کرام، مسلمانوں کی تعلیمی انجمنوں اور طلبہ کو کسی قسم کی نمائندگی کا مستحق نہیں گردانا گیا ہے۔ اس بل نے جامعہ کے ملازمین سے کسی معاملہ میں عدالتی چارہ جوئی کا بنیادی حق بھی چھین لیا ہے۔

یہ ہے اس مقصد کا حشر جس کا اظہار شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو اسکی تاسیس کے موقع پر کیا تھا کہ "ہماری تعلیم کا ہر قسم کے خارجی کنٹرول سے بالکل آزاد ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے تاکہ ہم اپنے افکار و عقائد، اخلاق و اعمال اور سلوک و کردار کے معاملہ میں خبیث اور اجنبی اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔" اور یہ ہے ان خوابوں کی تعبیر جو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے دیکھے تھے کہ "مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہمارے ماہرین تعلیم کل ہندوستان میں کوئی ایسے تعلیمی نظام تجویز کرنے لگیں تو مسلمانوں کی اس درخواست کو خوشی قبول کریں گے کہ وہ اپنا تعلیمی نظام اپنی ثقافت کی بنیاد پر قائم کریں۔" اور یہ کہ "اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ دل میں لئے ہے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں اور دیکھ کر سیکھ سکیں اور برت کر اپنا سکیں اور سنوار سکیں جہاں ان کے معاشی و تعلیمی و تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے۔"

آئیے یہ تسلیم ہے کہ جن مقاصد کے تحت اور جن تمناؤں کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا تھا وہ مقاصد پورے نہیں ہوئے۔ اور وہ تمنائیں بر نہیں آئیں اور اسلام اور مسلمانوں کی وہ شان وہاں قائم نہ ہو سکی جس کی حسرت ان کے بانیوں نے کی تھی بلکہ ان اداروں سے کمیونسٹ اور اسلام بیزار افراد کی کھیپ کی کھیپ نکلتی رہی لیکن ساتھ ہی ہم اس حقیقت کا

انکار ابھی نہیں کیا جا سکتا کہ دین اسلام سے گہرا تعلق اور مسلمانوں سے ہمدردی رکھنے والے ایسے معاصر و قارئین بھی کم نہیں ہیں جو انہی اداروں کے فارغ اور انہیں کے پروردہ ہیں۔

ہمارا مطالبہ ہے کہ ہمیں ہمارا دستوری حق ملنا چاہئے۔ ہم نہ مایوس ہیں اور نہ پست حوصلہ بلکہ یقین رکھتے ہیں کہ آج نہیں تو کل عملاً ہمارا مسلم اقلیتی کردار بھی ضرور بحال ہوگا۔

"حیاتِ نو" ایک علمی، تحقیقی، دینی اور ادبی پرچہ ہے۔ ظاہر ہے اس میں چٹکلے، تفریحی اور سطحی قسم کے مضامین کا گزر نہیں اور ظاہر ہے اس کے قارئین علم دوست احباب ہی ہوں گے اور ان کی تعداد ہمارے درمیان کتنی کم ہے سب جانتے ہیں۔ پرچوں کے معاملے میں دنیا کا ایک مخصوص ذوق ہے۔ اور ہم اس ذوق کی آبیاری نہیں کر سکتے۔ قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس قسم کے تحقیقی پرچوں کا اپنے پیروں پر کھڑا ہونا کتنا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے پرچے عام کئے جائیں اور لوگوں کے اندر نیا ذوق پیدا کیا جائے۔ یہ بڑا محنت طلب، دشوار اور صبر آزما کام ہے۔ ہم نے اللہ کے بھروسے پر اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور اسے پابندی سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ اسی غرض سے اس کی توسیع اشاعت کے پیش نظر برادر ولی اللہ سعیدی فلاحی مہاراشٹر کے دورہ پر گئے ہوئے ہیں۔ ملک کے اور دوسرے علاقوں میں بھی ان کے دورے کا پروگرام ہے۔ ہم قارئین "حیاتِ نو" اور متعلقین و ہمدردان جامعہ سے بجا طور پر ہر طرح کے تعاون کی امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنا قیمتی وقت فارغ کریں گے، ان کے ساتھ نکلیں گے، لوگوں سے تعارف کرائیں گے اور اہل علم و اہل خیر حضرات سے ملاقاتیں کروائیں گے۔

---

* ادھر آئے دن مجلہ "حیاتِ نو" کی کاپیاں ڈاک سے واپس آ رہی ہیں، اس طرح سے کہ ریپنگ والا کاغذ بھی غائب ہے جس پر پتہ درج ہوتا ہے۔ ہمارے لئے یہ پتہ لگانا سخت دشوار ہے کہ یہ کن خریداروں کے پرچے ہیں اور کہاں سے واپس آئے ہیں۔ نہیں معلوم ایسا کیوں ہے۔ ڈاک کی خرابی ہے یا کوئی اور معاملہ ہے۔ ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں اور ان سے امید رکھتے ہیں کہ اگر مجلہ انہیں نہ ملا ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں گے۔ ●●

ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی

یہ جہاد نہیں، خودکشی ہے

بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلم عوام ایک طویل عرصے سے سخت حیرانی کا شکار ہیں۔ اس حیرانی کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہیں اس کا ایک بہت بڑا سبب خود مسلم رہنماؤں اور لیڈروں کی غلط اندیشی اور غلط رہنمائی ہے۔

آج سیاسی حلقوں کے علاوہ بہت سے مذہبی حلقوں کی طرف سے بھی مسلمانوں کو مسلسل یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ موجودہ ہندوستان میں ان کے مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ وہ اپنائے وطن کے ساتھ کسی نرمی و رواداری سے کام نہ لیں۔ وہ ان کے مقابلے میں جس قدر بھی ممکن ہو جوش و حمیت کا مظاہرہ کریں۔ اور اگر وہ خوشی خوشی ان کے حقوق کو تسلیم نہیں کرتے تو بزور قوت انہیں اعتراف حقیقت پر مجبور کریں۔

نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ آج قوم کو جہاد سے متعلق آیات و احادیث سنا کر انہیں مسلح جہاد کے لئے کمر بستہ ہونے کی دعوت دی جا رہی ہے اور جو لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں انہیں کم ہمتی، بزدلی یا بے حمیتی اور بے غیرتی کے طعنے دیئے جا رہے ہیں۔

اگر بات خالص سیاسی حلقوں یا سیاسی رہنماؤں تک ہی محدود ہوتی تو معاملہ پھر بھی آسان تھا اور اس سلسلے میں ہم جیسے لوگوں کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے کہ مسلم عوام اس وقت خود سمجھ لیتے کہ یہ سیاسی سورماؤں کا خالص سیاسی نعرہ ہے جس کا دین و مذہب اور علم و بصیرت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نعرہ صرف اس لئے لگایا جا رہا ہے کہ ایک بھیڑ جمع کر کے اپنی لیڈری چمکائے اور سیاست کے افق پر ابھرنے کا موقع ہاتھ آ جائے۔ اور اس وقت مسلمان خود اپنے لئے صحیح موقف متعین کر لیتے اور ان مفاد پرست لیڈروں کا آلۂ کار بننے کی ذلت نہ گوارا کرتے۔

مگر افسوس ہے کہ سیاسی حلقوں سے گزر کر بہت سے دینی و مذہبی حلقوں کی طرف سے بھی مسلسل اسی قسم کے نعرے لگائے جا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بہت سے مسلم نوجوان غلط فہمیوں کا شکار ہو کر حمیت بے جا سے سرشار ہو گئے اور پھر وہ خالص دینداری کے جذبے سے لگاتار ایسی حرکتیں کرتے رہے جو دین و مذہب کی منشا کے سرتاسر خلاف تھیں اور شریعت کے اندر کسی بھی درجہ میں ان کی گنجائش نہ تھی۔

یہ صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ ذرا سنجیدگی سے معاملے کی نوعیت پر غور کیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ آج ہمارے رہنما جہاد کے عنوان سے جس طرز عمل کا ہم سے مطالبہ کر رہے ہیں کیا قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کو جہاد کہا جا سکتا ہے؟ اور کیا آج جو لوگ ملی مسائل میں جوش و جذبہ کا مظاہرہ کر رہے ہیں وہ واقعتاً خدا کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں؟

اسلام میں مسلح جہاد کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کے لئے آگے بڑھنے والے افراد بالکلیہ اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر چکے ہوں۔ وہ اپنے تمام شخصی مفادات اور سیاسی مصالح سے بلند ہو کر خالص اللہ کی رضا جوئی اور اس کے دین کی خیر خواہی کے لئے یکسو ہو چکے ہوں۔ وہ اپنے ظاہر و باطن کو جاہلیت کی نجاستوں سے پاک کر کے تقویٰ و طہارت کی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر چکے ہوں۔ وہ اپنی زندگی کے اندر سے تمام غیر اسلامی نقشوں کو مٹا کر خالص قرآنی سیرت و کردار کا نمونہ بننے کا عزم رکھتے ہوں۔ نماز ان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بن چکی ہو۔ زکوٰۃ و انفاق سے انھیں قلبی راحت حاصل ہوتی ہو۔ نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ان کی زندگی کا نصب العین ہو۔

یہ میدان جہاد میں اترنے کے لئے اولین شرط ہے اور جب تک یہ شرط پوری نہ ہو اس وقت تک کوئی جدوجہد اسلامی جدوجہد نہیں قرار دی جا سکتی اور نہ اسے جہاد کا مقدس نام دیا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرن اول کے مسلمانوں کو اس وقت تک قتال کی اجازت نہیں دی گئی جب تک کہ انھوں نے عملی طور پر ثابت نہیں کر دیا کہ ان کے دل اللہ کی محبت کے لئے خالص ہو چکے ہیں اور اب اگر انھیں اقتدار حاصل ہو جائے تو وہ نمازوں کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ و انفاق کا اجتماعی نظام قائم کریں گے، ان کی ساری قوتیں نیکی کی اشاعت میں صرف ہوں گی اور وہ ہمیشہ

بدکاریوں سے برسرپیکار رہیں گے۔ (الذین ان مکناهم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وأمروا بالمعروف ونهوا عن المنكر ولله عاقبة الأمور) (سورۂ حج ۴)

جہاد کے لئے دوسری شرط ہے اتمام حجت یعنی کسی گروہ یا کسی قوم سے اس وقت تک جہاد جائز نہیں جب تک اسلام کی دعوت نہایت واضح اور موثر انداز میں اس کے سامنے پیش نہ کر دی جائے کہ یا تو وہ شوق و محبت کے ساتھ اسے قبول کر لے یا بصورت دیگر اسے قبول نہ کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی عذر نہ رہ جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کبھی کسی قوم کی اس وقت تک گرفت نہیں فرمائی جب تک انبیاء و رسل کے ذریعہ سے ان پر حجت تمام نہیں فرما دی۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

رسلا مبشرين ومنذرين لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل وكان الله عزيزا حكيما۔ (سورۃ النساء: ۱۶۵)

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جہاد عوام الناس سے نہیں بلکہ ان تمام حق دشمن طاقتوں سے ہوا کرتا ہے جو اسلام کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکتی ہیں وہ عام لوگوں کے لئے یہ حق تسلیم نہیں کرتیں کہ وہ اپنی رائے اور اپنی مرضی سے اپنے لئے کوئی صحیح راہ اختیار کر سکیں۔ اس وقت اسلام آگے بڑھتا ہے تاکہ راستے کے ان پتھروں کو صاف کرے اور لوگوں کے لئے یہ موقع فراہم کرے کہ وہ چاہیں تو بلا روک ٹوک اپنے رب کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کی طرف بڑھ سکیں اور اس کو اپنا کر دنیا و آخرت کی کامرانیاں حاصل کر سکیں۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی لڑائی کبھی بھی عام لوگوں سے نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ ان ڈاکوؤں سے ہوتی ہے جو اللہ کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کر کے اللہ کے اقتدار کو چیلنج کرتے ہیں اور اس کے بندوں کو زبردستی اپنے آگے جھکنے اور خود اپنے گھڑے ہوئے غیر عادلانہ قوانین کو ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام جب ان ظالم طاقتوں سے جہاد کے لئے آگے بڑھتا ہے تو ان کے زیر اثر یا زیر اقتدار رہنے والے عوام کی ہمدردیاں ان کے ساتھ نہیں بلکہ اسلام کے ساتھ ہوتی ہیں

اور وہ خود اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ وہ ان طاقتوں کے شکنجوں سے نکل کر اسلام کے سایۂ رحمت میں آجائیں۔

اب اگر کہیں صورت حال یہ ہو کہ حکومت کے بجائے خود عوام سے کشمکش کی صورت پیدا ہو جائے۔ وہ اسلام کے خواہاں اور اس کے قدرداں ہونے کے بجائے اس سے بیزار اور اس کی طرف سے نفرت و بدگمانی کا شکار ہوں۔ تو ایسی صورت میں نہ صرف یہ کہ ان سے جہاد ناجائز ہوگا بلکہ ہمارا فرض ہوگا کہ ہم شفقت و محبت کا پیکر بن کر ان کے سامنے آئیں اور حسن اخلاق سے ان کے دلوں کو جیتیں اور اسلام کے سلسلے میں ان کی نفرت و بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ انتہائی دلسوزی و دردمندی کے ساتھ ہم ان پر یہ واضح کریں کہ اسلام ٹھکرانے کی چیز نہیں بلکہ سینے سے لگانے کی چیز ہے۔ وہ کسی خاص شخص یا خاص گروہ کی چیز نہیں بلکہ وہ ان کے اور سارے انسانوں کے رب کا بھیجا ہوا پیغام اور اس کا پسند کیا ہوا نظام ہے۔ وہ انسانوں کو زحمت و پریشانی سے دوچار کرنے کے لئے نہیں بلکہ انھیں رحمتوں اور کامرانیوں سے ہمکنار کرنے کے لئے آیا ہے۔

مختصر یہ کہ ہم ان کے ساتھ کسی تشدد کی پالیسی اختیار کرنے کے بجائے حکمت و محبت کے ساتھ ان پر اسلام کی حجت تمام کریں اور علمی، فکری، ذہنی، عقلی اور اخلاقی ہر لحاظ سے اس کی قدر و قیمت اور اس کی افادیت کو تسلیم کرنے پر انھیں مجبور کر دیں۔

جہاد کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ ہمیں ایک آزاد ریاست حاصل ہو جو کسی دوسری طاقت کے زیر اثر نہ ہو جہاں ہمیں اس بات کا پورا پورا موقع حاصل ہو کہ ہم اسے اپنا مرکز بنا کر وہاں اپنی طاقتوں کو مجتمع اور اپنی صفوں کو منظم کر سکیں اور پھر وہاں سے اپنی پلاننگ کے مطابق اپنی جہادی سرگرمیوں کا آغاز کر سکیں ورنہ کسی نظام کے تحت رہتے ہوئے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا یا کسی ملک میں رہتے ہوئے وہاں والوں کے خلاف مارچ کا پروگرام بنانا یا تشدد کی کوئی پالیسی اختیار کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے ناجائز ہے۔ یہ اسلام کی نگاہ میں جہاد نہیں بلکہ خودکشی ہے۔ اس لئے کہ اس میں نفع کا امکان کم ہے اور تباہی کا خطرہ زیادہ ہے۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ترجمان القرآن علامہ حمیدالدین فراہی

رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"تاریخ گواہ ہے کہ سرکشوں کا حال ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے۔ انھوں نے اپنی رعایا کے حقوق اس وقت تک تسلیم نہیں کئے ہیں جب تک تلوار نے ان کو مجبور نہیں کر دیا ہے۔ اس وجہ سے انبیاء کی سنت ایسے سرکشوں کے معاملے میں یہ رہی ہے کہ اتمام حجت کے بعد جب وہ ان سے مایوس ہو گئے ہیں اور توبہ و انابت کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی ہے تو وہ ان کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے ہیں۔ قوم کے اندر رہتے ہوئے تلوار اٹھانا جیسا کہ ہم اپنی کتاب ملکوت اللہ میں مفصل لکھ چکے ہیں، نظام معاشرت کی بربادی کا سبب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے انبیاء کرام نے تلوار اٹھانے کے بجائے علیحدگی کی روش اختیار فرمائی۔ قرآن مجید اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں اس کے دلائل بکثرت ملیں گے۔" (ملاحظہ ہو: تفسیر سورۂ کافرون۔ ص ۳۸)

پھر آگے مزید فرماتے ہیں:

"ان روایات سے معلوم ہوا کہ ہجرت درحقیقت تمام کفار و مشرکین سے اعلان جنگ تھی اس وقت ایک نئی امت ظہور میں آگئی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک مستقر بھی حاصل ہو گیا اور ایک چھوٹی سی جماعت کی تائید و رفاقت بھی حاصل ہو گئی جس سے ایک حد تک وہ شرطیں پوری ہو گئیں جن کے بغیر جنگ ناجائز ہے۔" (ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ کافرون ص ۴۶)

گویا مکہ میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو جنگ یا تشدد کی اجازت نہ دینے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں انھیں کوئی ایسا آزاد خطہ نہیں حاصل تھا جو ان کا مرکز و مستقر بن سکے اور جہاں وہ اپنی صفوں کو منظم کر سکیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں جنگ کا نتیجہ ہلاکت و تباہی اور نظام معاشرت کی بربادی کے سوا اور کچھ نہ نکلتا۔

جہاد کے لئے چوتھی شرط یہ ہے کہ ہماری ایک دردمند اور بیدار مغز قیادت ہو جو اس پوری ملت کی شیرازہ بندی کر سکے جو مسلمانوں کے درمیان سے تمام اختلافات اور گروہی تعصبات کو دور کر کے انھیں ایک بلند اور پاکیزہ مقصد کے لئے جمع کر سکے جو ان کے درمیان سے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو ختم کر کے انھیں دینی اور اسلامی اخوت کی لڑی میں پرو سکے جس کی خدا پرستی اور بے نفسی ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو جس کی حکمت و فراست حالات کی نبض شناس ہو

اور جو بروقت صحیح فیصلے کی قوت رکھتی ہو۔

ایک ایسی کامیاب اور قابلِ اعتماد قیادت جب تک ہمیں نہ حاصل ہو اس وقت تک اس طرح کی کوئی اسکیم بنانا جس طرح کی اسکیمیں آج کل ہمارے پرجوش نوجوان بنایا کرتے ہیں، ایک تماشائے عام یا ایک سعیِ ناکام کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہی وہ چار بنیادی شرطیں ہیں جن کا پایا جانا کسی بھی جہادی مہم کے لئے ناگزیر ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آج ہمارے رہنما اس ملک میں جو مہم چلا رہے ہیں یا چلانا چاہتے ہیں کیا اس میں بھی یہ شرطیں پائی جاتی ہیں۔

کیا آج ہمیں کوئی ایسی دردمند اور بیدار مغز قیادت حاصل ہے جو روز بروز بگڑتے ہوئے حالات کا صحیح تجزیہ کر سکے، ملی امراض کی صحیح تشخیص کر سکے، قوم کو درپیش مسائل کا بہتر حل پیش کر سکے، سینوں میں اُمڈنے والے جذبات کو صحیح رُخ دے سکے، حمیتِ جاہلی اور حمیتِ اسلامی میں فرق و امتیاز کر سکے، ملت کی قیمتی توانائیوں اور بیش بہا صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے بچا سکے، کیا چیزیں اہم ہیں اور کیا چیزیں غیر اہم اس نکتہ کو وہ سمجھ سکے۔ پھر جو چیز اہم ہے اس کی اہمیت کس درجہ کی ہے اس چیز کا بھی وہ ادراک کر سکے۔

مثال کے طور پر بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔ کیا واقعۃً یہ مسئلہ اسی اہمیت کا حامل تھا جو ملت اسلامیہ ہند کے رہنماؤں نے آج اس کو دے رکھا ہے۔ کیا آج ملت کی ساری عزت و آبرو اسی مسئلہ سے وابستہ ہے؟ کیا آج ملت کا وجود اور اس کا تشخص اس مسجد کی بازیابی پر ہی منحصر ہے؟ کیا کسی افتادہ و ویران مسجد کا مندر میں تبدیل ہو جانا اتنا سنگین واقعہ ہے کہ اس کے لئے ایک قیامت برپا کر دی جائے اور پوری ملت سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ سر سے کفن باندھ کر اس کے لئے میدان میں نکل آئے؟

یہ صورتِ حال نہ صرف ہماری قیادتوں کی سیاسی بے بصیرتی اور فکری بے مائیگی کا پتہ دے رہی ہے بلکہ یہ اس بات کی بھی غمازی کر رہی ہے کہ انھوں نے اس دین رشد و ہدایت کے مزاج کو ہی نہیں سمجھا۔ ورنہ یہ مسجد کی حرمت اور تحفظ کا بہانہ بنا کر پورے ملک میں ہندو مسلم کشیدگی پیدا کرنے اور وسیع پیمانے پر نفرت و تعصب کی آگ بھڑکانے کے کیا معنی؟

کیا اسلام ہمیں اسی حکمتِ عملی کی تعلیم دیتا ہے؟ یا کیا اسلام کے لغت میں شجاعت و مردانگی کا یہی مفہوم ہے؟

کیا شجاعت و مردانگی کے لئے بے وقوفی اور ناعاقبت اندیشی بھی شرط ہے؟

اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر اس امت کو اس لئے تو نہیں برپا کیا تھا کہ وہ مسجد و مندر کے جھگڑوں میں اپنی توانائیوں کو ضائع کرے اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان لوگوں کو اپنا حریف بنائے جن کے درمیان اسے دعوتِ حق اور شہادتِ حق کا کام کرنا تھا۔ اسلام میں ان مساجد کو یہ اہمیت تو نہیں دی گئی ہے کہ ان کے لئے ہم تمام دینی تقاضوں اور اسلامی قدروں کو داؤ پر لگا دیں۔ جس عظیم کام اور جس عظیم مقصد کے لئے ہمارے خالق نے ہم کو وجود بخشا ہے اسی کام اور اسی مقصد کو ہم قربان کر دیں۔

اسلام میں اصل اہمیت اس کام کی اور اس مقصد کی ہے نہ کہ کسی اور چیز کی۔

مسلمانوں کے اندر جب تک اپنے منصب و مقام کا زندہ شعور اور اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس رہا اس وقت تک ان کی تمام سرگرمیاں بھی ہوتی تھیں اسی اصل مقصد اور اصل کام کو سامنے رکھ کر ہوتی تھیں۔ وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرتے تھے جس سے ان کی دعوت کی راہیں مسدود ہو جائیں یا لوگ ان کی طرف سے متنفر یا بدگمان ہو جائیں۔ اس کے برعکس وہ دلوں کو جیتنے اور ذہنوں پر اپنا اخلاقی اثر قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

آخر خانہ کعبہ میں بھی تو سیکڑوں بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر بیس سال تک مسلمانوں نے کامل صبر و ضبط سے کام لیا اور اس پوری مدت میں کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جو دعوتی مصلحتوں کے خلاف ہو۔ پھر جب مناسب وقت آگیا تو دیکھتے دیکھتے خانہ کعبہ تمام بتوں سے پاک ہو گیا۔

آج بھی ضرورت تھی کہ ہم اپنے منصب و مقام کو پہچانتے، خیر امت ہونے کی حیثیت سے ہمارے خالق نے ہم پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں ان کو محسوس کرتے اور تشدد اور جذباتیت کی پالیسی کو چھوڑ کر نرمی و دلجوئی کی روش اختیار کرتے۔

آج اگر ہم کسی مسجد سے دست بردار ہو کر کوئی ایک دل بھی جیت سکیں تو یقیناً یہ کوئی خسارے کا سودا نہ ہوگا۔ البتہ یہ کتنا زبردست خسارہ اور کیسا عظیم سانحہ ہوگا اگر کسی ایک

مسجد کے حصول کی خاطر ہم پورے ملک کی دشمنی مول لینے کے لئے تیار ہو جائیں اور ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کے اسلام سے متنفر ہو جانے کا سبب بن جائیں۔

یاد رکھئے! اسلام میں بس تین مسجدیں ایسی ہیں جن سے ہم کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہو سکتے اور جن کا یہ مقام ہے کہ وقت آجائے تو جان پر کھیل کر ہم ان کی حفاظت کریں اور ان کے تحفظ کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالیں جو ہمارے بس میں ہو۔

ایک مسجد حرام ہے، دوسری مسجد نبوی ہے اور تیسری مسجد اقصیٰ۔

البتہ ان تینوں مسجدوں کے علاوہ کوئی اور مسجد ایسی نہیں ہے جس کے لئے ہم جان کی بازی لگائیں یا دوسروں کو اس کی دعوت دیں۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری دینی غیرت یہ تو گوارا کر لیتی ہے کہ ہماری مسجدیں ہماری دینی بے غیرتی کا شکوہ کریں اور وہ ہماری نمازوں اور ہمارے سجدوں کے لئے ترستی رہیں۔

وہ یہ بھی گوارا کر لیتی ہے کہ مسجد میں کسی "حضرت" بابا کو لا کر بٹھا دیا جائے اور پھر ان سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی دعائیں کی جائیں۔ ان سے روزی اور صحت مانگی جانے اور ان کے طاق پر جلنے والی اگربتی کی راکھ کو دوائے شفا سمجھ کر نہایت عقیدت کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

یہ اور اس قبیل کی تمام مکروہ حرکتوں کو تو ہماری دینی غیرت گوارا کر لیتی ہے البتہ وہ یہ گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی کہ اپنی کسی مسجد سے کسی دوسرے کے حق میں دست بردار ہو کر اپنی ملت کو بہت سی پریشانیوں سے بچالے جائے اور دینی اور اجتماعی حیثیت سے اس کو جو بہت سے نقصانات پہنچ سکتے ہیں ان نقصانات سے وہ اپنے آپ کو محفوظ کر لے۔

اب یہ ہماری قیادتوں کا کام تھا کہ وہ ملت کے اندر دین کا صحیح شعور پیدا کریں اور نوجوانوں کے سینوں میں امڈنے والے جذبات کو کسی منفی رخ پر نہ بہنے دیں بلکہ انھیں صحیح رخ پر لگا کر ان سے مثبت نتائج حاصل کریں اور اس ملک میں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو نہایت حکمت کے ساتھ دوبارہ بحال کرنے کی جد و جہد کریں۔

مگر سوال یہ ہے کہ آج ہمارے پاس ایسی دور اندیش اور خدا پرست قیادت ہے کہاں جو

اس کارِ عظیم کو سرانجام دے سکے۔

پھر نہ صرف یہ کہ اس وقت ہمیں کوئی کامیاب قیادت نہیں میسر ہے جو کسی بھی جہادی مہم کے لئے انتہائی ناگزیر ہے بلکہ آج ہمیں کوئی ایسا چھوٹے سے چھوٹا آزاد علاقہ بھی نہیں حاصل ہے جہاں ہم آزادانہ طور پر اپنی قوتوں کو مجتمع اور اپنی صفوں کو منظم کر سکیں۔

اس کے علاوہ آج ہمارے پاس کوئی ایسی جمعیت یا جماعت بھی نہیں ہے جس نے بالکلیہ اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دیا ہو اور جس سے یہ توقع کی جا سکتی ہو کہ اگر انھیں اختیارات حاصل ہو جائیں تو وہ بدمستی کا شکار نہیں ہوں گے اور وہ دین حنیف کے علمبردار اور شریعت کے تمام اوامر و نواہی کے پابند ہوں گے۔

پھر جہاد کی چوتھی شرط جس کے بغیر کسی قوم سے جہاد جائز ہی نہیں ہے وہ اتمام حجت ہے۔ کیا آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے برادرانِ وطن پر دین کی حجت تمام کر دی ہے اور صحیح طور پر ان تک اسلام کی دعوت پہنچا دی ہے؟

آج ہم نے نہ صرف یہ کہ صحیح طور سے ان تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچائی ہے بلکہ اس کے برعکس ان کے سامنے اسلام کی غلط نمائندگی کی ہے۔ آج ہم نے اپنے قول و عمل سے ان کے سامنے اسلام کی جو تصویر پیش کی ہے وہ انھیں اسلام سے قریب کرنے والی نہیں بلکہ دور کرنے والی ہے۔ گویا ہم نے ان پر اسلام کی حجت نہیں تمام کی ہے بلکہ انھیں اس کے سلسلے میں اور غلط فہمیوں میں ڈال دیا ہے۔ ایسی صورت میں ان سے مسلح جہاد کے بارے میں سوچنا بھی جائز نہیں، چہ جائیکہ عملاً اس طرح کی کوئی کارروائی کی جائے۔

اس ساری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ہم جس صورت حال سے گذر رہے ہیں اس میں تشدد کی کوئی بھی پالیسی اختیار کرنے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہمارا فرض ہے کہ ہم نرمی و رواداری سے کام لیں۔ برادرانِ وطن کے ساتھ الفت و مودت کا معاملہ کریں۔ اخلاقی حیثیت سے ان کے دلوں کو جیتنے کی کوشش کریں اور ایک خدا بیزار اور حق سے برگشتہ قوم کو حق کی طرف بلانے اور خدا سے قریب کرنے کے لئے جو بہتر سے بہتر فضا درکار ہے وہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

باقی ص ۴۵ پر

جمال عبدالناصر کے سیاسی خفیہ گوشے

الاستاذ محمد بہاء الدین الامیری

سید قطب شہید نے جیل سے ہماری طرف دو خط ارسال کیے۔ ایک حمیدہ قطب کے شوہر حمدی مسعود کے ہاتھ بھیجا مگر وہ ہم تک پہنچ سکا لیکن دوسرا خط مل گیا جس میں انھوں نے لکھا تھا "آپ ہمارے اور جمال عبدالناصر کے مابین مذاکرات کی راہ ہموار کریں۔ ہم یہ ضمانت دینے کے لئے تیار ہیں کہ اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں جو الزامات ہم پر عائد کئے گئے زیادہ تر جھوٹے ہیں۔ جمال عبدالناصر کو ہمارا راستہ کھلا چھوڑ دینا چاہیے تاکہ ہماری سرگرمیاں کمیونسٹوں کے خلاف جاری رہیں جو نوجوان نسل کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے بھی جمال عبدالناصر کی مخالفت کے لئے ہمارے پاس فرصت نہیں۔ جن کا یہ آلۂ کار بنا ہوا ہے وہ خود ہی اس کے لئے وبال جان بن جائیں گے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں نوجوانوں کی تربیت اور رہنمائی کا موقع میسر آنا چاہیے۔"

ہم تمام دوستوں نے، جن میں عصام عطار بھی تھے، مشورہ کیا کہ اب کیا ہونا چاہیے۔ یہ ۱۹۶۵ء کے اواخر کی بات ہے۔ ہم نے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہواری بومدین کی وساطت سے مفاہمت کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ میں نے الجزائر کا رخ کیا۔ اس وقت میرے پاس دو خط اور بھی تھے، ایک مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی کا تھا جس میں اس امر کی مصدقہ دستاویزات موجود تھیں کہ "جمال عبدالناصر اور امریکہ مسئلہ فلسطین سرد خانے میں ڈالنے کے لئے خفیہ معاہدہ کر چکے ہیں۔"

دوسرا خط یاسر عرفات کی طرف سے تھا جس میں لکھا تھا کہ جمال عبدالناصر کی جانب سے ہمارا گلا گھونٹا جا رہا ہے اور ہمیں خطرہ ہے کہ یمن کی جنگ کے باعث مسئلہ فلسطین کو نقصان پہنچے گا۔ الجزائر کے سوا ہمیں کسی ملک سے تعاون کی توقع نہیں۔ اگرچہ الجزائر کے

فوجی سربراہ حال ہی میں برسر اقتدار آئے ہیں، تاہم امید ہے ملکی سیاست اور پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہوگی۔

جب میں الجزائر پہنچا تو دارالبیضاء میں ۱۹۶۵ء کی عرب کانفرنس کی بھرپور تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بومدین سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ مہمانوں کو خوش آمدید اور الوداع کہنے کے لئے اکثر اوقات ایئرپورٹ آنا جانا پڑتا ہے۔ آپ شریف بالقاسم کو تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیں۔ میں ممکن حد تک آپ سے تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں۔

میں نے اس اہم مسئلے کی تمام جزئیات اس خیال سے تحریر کر لیں کہ مبادا یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے۔ مالک بن نبی کو اپنے ساتھ لے کر میں شریف بالقاسم سے ملاقات کے لئے چلا گیا۔ اس سے دو گھنٹے تک ہماری نشست رہی۔ شریف بالقاسم تمام معلومات لے کر گیا۔ یہ تمام بومدین کے پاس دارالبیضاء پہنچی تو بومدین نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا: "جمال عبدالناصر، اخوان المسلمین کے مسئلے پر کوئی گفتگو کرنے کے لئے تیار ہے نہ اپنا فیصلہ تبدیل کرنا چاہتا ہے۔"

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ ۱۹۵۴ء میں جب میں شام کی طرف سے سعودی عرب میں بطور سفیر مقیم تھا، اس وقت بعض عرب ممالک جمال عبدالناصر سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ اخوان المسلمین کے نظربند رہنماؤں کی سزائیں تخفیف کر دے۔ ان میں استاذ ہضیبی، عبدالقادر عودہ، محمد الفرغلی، یوسف طلعت اور ان کے دیگر ساتھی شامل تھے جنھیں سزائے موت سنا دی گئی تھی۔ افسوس کہ تمام کوششیں کسی مثبت نتیجے پر نہ پہنچیں۔ چنانچہ میں نے ملک سعود سے ایک ہنگامی ملاقات کے لئے وقت لیا۔ یہ ملاقات عصر کے بعد ہوئی۔ میں نے ان سے اپنا مقصد بیان کیا تو شاہ نے بڑی افسردگی سے کہا:

"میں اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کر چکا ہوں حتیٰ کہ ہم نے یہ پیشکش بھی کی کہ اخوان المسلمین کے قیدی رہنماؤں کو خاندانوں سمیت سعودی عرب میں بھیج دیا جائے۔ جمال عبدالناصر کے خلاف انھیں کسی قسم کی سرگرمیوں کی اجازت نہ ہوگی۔ لیکن اس نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ اب تم بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا: "آپ یہ خدمت ضرور انجام دیں جو ایک تاریخی کارنامہ ہوگی۔ آپ اپنے ولی عہد فیصل کو مصر بھیج دیں۔ ممکن ہے اخوان المسلمین کے قید کی رہنما پھانسی کی سزا سے نجات پا جائیں۔" شاہ سعود نے کہا: "ٹھیک ہے۔ ہم یہ کوشش بھی کر ڈالتے ہیں اور معاملات تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔" چنانچہ اسی روز مغرب کے بعد ولی عہد فیصل شاہی طیارے پر مصر روانہ ہو گئے۔

تین بجے شب ملک سعود کی طرف سے مجھے پیغام ملا کہ فیصل جب قاہرہ پہنچے تو ان کے جانے سے پہلے ہی اخوان المسلمین کے قائدین تختۂ دار پر لٹکائے جا چکے تھے۔ البتہ استاذ ہضیبی بیمار ہونے کی وجہ سے اسپتال منتقل کر دیے گئے تھے کہ تندرست ہونے کے بعد انہیں بھی قافلۂ شہداء میں شامل کر دیا جائے۔ ولی عہد فیصل نے استاذ ہضیبی کے متعلق کوشش کی کہ اس کی پھانسی کا حکم منسوخ کر دیا جائے۔

دوسرے دن گیارہ بجے امریکی سفیر وڈز میرے پاس آیا جو عمر رسیدہ اور بڑے ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ دوران گفتگو اس نے خود سے کہا: "کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس احمق نے کیا کر ڈالا ہے؟"

میں نے پوچھا "کون وہ؟"

اس نے جواب دیا: "عبدالناصر"

میں نے پوچھا: "اس نے کیا کیا ہے؟"

کہنے لگا "اس نے اخوان المسلمین کے رہنماؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیے جبکہ ہم اتنی بڑی کارروائی کے حق میں نہ تھے۔" تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے کہا: "البتہ ہمارے اور اس کے درمیان خفیہ معاہدہ طے پا چکا ہے جس کی دو شقیں ہیں:

۱۔ دس برس تک مسئلۂ فلسطین تعطل میں رکھا جائے۔

۲۔ اخوان المسلمین کی سرگرمیوں پر پابندی عائد رہے۔ لیکن ہم نے یہ نہیں کہا تھا کہ اخوان المسلمین کا خون بہایا جائے۔ اب اس تشدد کا نشانہ بننے والے امریکہ کے ابدی دشمن بن جائیں گے امریکہ کا یہ منشا ہرگز نہیں، لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے؟"

میں نے اس سے کہا: "امریکہ اخوان المسلمین سے خائف کیوں ہے جس کی وجہ سے عبدالناصر سے خفیہ معاہدہ کرنا پڑا؟"

وہ کہنے لگا: "اخوان المسلمین کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟"

میں نے کہا: "میرے خیال میں وہ بہت اچھی تنظیم ہے جو غریب لوگوں کے علاج کے لیے ہسپتال قائم کرتی ہے۔ مظلوموں کی حمایت کے لیے وکلا کی اعانت کرتی ہے، اور معاشرے سے جہالت مٹا دینا چاہتی ہے۔"

اس نے کہا: "بس یہی کچھ جانتے ہیں؟" میں نے جواب دیا "جی ہاں"۔ وہ بولا: "پھر آپ اسے جانتے ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا: "آپ کے نزدیک وہ کیا چیز ہے؟" اس نے کہا: "یہ تنظیم اس وقت دنیا بھر میں مغربی تہذیب کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔"

"وہ کیسے؟ آپ نے یہ حکم کیسے صادر کر دیا؟"

امریکی سفیر نے جواب دیا: "وہ نوجوانوں کی عسکری تربیت دے رہے ہیں اور انہیں زبردست قوت بنا رہے ہیں۔ جن چیزوں کا آپ نے ذکر کیا ہے یہ تو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور عوام کی حمایت حاصل کرنے کے بہانے اور حیلے ہیں تاکہ اس طرح وہ اپنا حکومت تک پہنچنے میں جلد کامیاب ہو جائیں۔ ہمیں جس سے خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ جب حکومت ان کے پاس آجائے گی تو یہ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کی سیاست نافذ کر ڈالیں گے جو ہماری تہذیب کے لیے قیامت سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے۔ یہی وجہ ہے امریکہ کو اخوان المسلمین کے بارے میں یہ موقف اختیار کرنا پڑا۔"

بعد میں میں نے یہ سب معلومات اور اہم گفتگو قلمبند کر کے اپنے دستخطوں کے ساتھ شام کی وزارت خارجہ کے سپرد کر دیں تاکہ ریکارڈ محفوظ رہے۔ ●●

(بشکریہ: اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۸۹ء لاہور)

قرآن کا تصورِ علم

جناب ڈاکٹر سید مسعود احمد صاحب

علوم کی اشاعت میں قرآن کا رول

چونکہ قرآن کا مخاطب انسان ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا خصوصی مظہر ہے نیز وہ خلافتِ الٰہی کے منصبِ عالیہ سے نوازا گیا ہے اور تسخیرِ کائنات کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی بھی ہے کہ "عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی۔ یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے" (حم السجدہ: ۵۳) اور سب سے اہم دلیل یہ کہ قرآن کے نزدیک علم کی فضیلت مسلّم ہے۔ (الزمر: ۹)[1]۔ ان تمام امور کا تقاضا ایک تو یہ ہے کہ قرآن علم کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرے۔ دوسرے یہ کہ ان تمام علوم کے فروغ و اشاعت میں اہم رول ادا کرے جو انسان کے لئے مفید ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآن زندگی کا ایک مکمل نظام پیش کرتا ہے اس لئے اس نے معاشیات (الاعراف: ۱۲)[2]، سیاسیات (آل عمران: ۲۶)[3]، تعزیری قوانین (البقرہ: ۱۷۸، ۱۷۹)[4]

۱؎ مزید دیکھیں الرعد: ۱۶، المجادلہ: ۱۱، الکہف: ۱۱۰، الحجرات: ۱۳

۲؎ مزید دیکھیں النحل: ۷، البقرہ ۱۹۸، ۱۸۶، ۱۸۸، ۲۷۵۔ التوبہ: ۳۴، ۳۵، ۶۰۔ الحشر: ۷

۳؎ مزید ملاحظہ ہو آل عمران ۱۰۴، ۱۸۹۔ الحج: ۴۱۔ الاحزاب: ۳۶۔ توبہ: ۱۱۲، الانعام: ۸۵۔ بنی اسرائیل: ۲۳، ۳۴۔ الممتحنہ: ۸

۴؎ مزید دیکھیں المائدہ: ۳۸۔ النور: ۲، ۴، ۵

قانونِ وراثت (النساء: ۷، ۹)، عدلیہ (النحل: ۹۰)[5]، انتظامیہ (الاحزاب: ۳۶)[6]، سائنس و فلسفہ (الانبیاء: ۲۱)[7]، اصولِ جنگ (النساء: ۷۵۔ الحجرات: ۹)، اصولِ امن (المائدہ ۳۳)[8] علومِ روحانی (العنکبوت: ۶۹)[9]، علومِ مادی (حم السجدہ: ۱۱)[10]، اخلاقیات (الحجرات ۱۱، ۱۲)[11] معاملات (بنی اسرائیل ۳۴، ۳۶)[12]، تاریخ و سیر، علومِ آثار (الاعراف ۶۹، ۷۴)[13] علومِ نفسیات (بنی اسرائیل ۱۱، ۶۷)[14]، علومِ عمرانیات (آلِ عمران ۱۱۰)[15] وغیرہ مختلف علوم سے بحث کرتا ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں راہِ حق دکھاتا ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے ایک مکمل کتاب ہے۔ (البقرہ: ۲۰۸)۔

رہا علومِ انسانی کے فروغ و اشاعت میں قرآن کا رول، تو یہ بھی بلا خوفِ تردید عرض کیا جاسکتا ہے کہ قرآن اس شعبۂ علم کے فروغ میں مہمیز لگاتا ہے جس سے نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچے گزشتہ صفحات میں علم کی اہمیت پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ قرآن کے تقاضوں کو سب

۵؎ مزید دیکھئے الممتحنہ: ۸۔ الحدید: ۲۵۔ النساء: ۵۹

۶؎ مزید دیکھئے المائدہ: ۳۳۔ النور: ۵۵۔ القصص: ۴

۷؎ مزید دیکھیں الانعام: ۳۸۔ یٰس: ۴۰۔ الرعد: ۲۔ طلاق: ۱۲۔ النحل: ۷۹ نیز ملاحظہ ہو راقم کا مضمون بعنوان "سائنسی تحقیقات کا قرآنی محرک" تحقیقاتِ اسلامی جولائی۔ ستمبر ۱۹۸۴ء

۸؎ مزید ملاحظہ ہو النور: ۲۷، ۲۸، ۵۵۔ القصص: ۴۔ الذاریات: ۱۹۔ المعارج: ۲۵

۹؎ نیز ملاحظہ ہو الزمر: ۲، ۳، ۱۱، ۱۴۔ البقرہ: ۳۶، ۱۷۷، ۱۸۳

۱۰؎ مزید دیکھئے الرعد: ۲۔ الانبیاء: ۳۱۔ الطلاق: ۱۲

۱۱؎ مزید دیکھئے بنی اسرائیل: ۵۳۔ النساء: ۵، ۹۔ الاحزاب: ۷۰۔ البقرہ: ۱۰۹، ۲۳۷

۱۲؎ مزید دیکھئے البقرہ ۸۸، ۱۷۷، ۲۵۱۔ الشوریٰ: ۳۸۔ الحجرات: ۱۰

۱۳؎ مزید دیکھئے المائدہ ۲۷ تا ۳۱۔ ہود: ۱۰۰۔ یوسف: ۳، ۱۱۱۔ آلِ عمران: ۱۳

۱۴؎ مزید دیکھئے ابراہیم: ۳۴۔ الاحزاب: ۷۲۔ الکہف: ۵۴۔ المعارج: ۲۱۔ العادیات: ۸

۱۵؎ مزید دیکھئے النساء: ۱، ۳، ۲۵

زیادہ سمجھنے والے یعنی خود صاحبِ قرآن (البقرہ: ۹۷)[1] حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: (۱) "علم کا حصول ہر مسلمان پر فریضہ ہے۔"[2] (۲) "میری بات پہنچا دو چاہے ایک ہی آیت ہو۔"[3] (۳) "حاضر غائب تک پہنچا دے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ براہِ راست سننے والے سے زیادہ حافظہ رکھتا ہو۔" (۴) "عالم کو عابد پر وہی فضیلت ہے جو تاروں پر بدرِ کامل کی ہے۔"[4] حضور اکرمؐ نے اپنے اقوال کے لکھنے کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "خدا کی قسم! محمدؐ کی زبان سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔" نیز طالب علم کی فضیلت کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "گویا وہ اس شخص کی طرح ہے جو رات بھر نوافل اور دن بھر روزہ رکھتا ہو۔"

حضور اکرمؐ کے یہ ارشادات قرآن کے منشا کی وضاحت کرتے ہیں کیونکہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ آپؐ پر جو وحی کی جاتی ہے وہی فرماتے ہیں۔ (النجم: ۳، ۴) خود قرآن مجید نے رسولِ اکرمؐ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے تعبیر کیا (النساء: ۸۰ - الاحزاب: ۳۶)۔

قرآن پاک کی متعدد آیات انسان کو کائناتی حقائق، تاریخی واقعات اور خود اس کے نفس کے کمالات و عجائبات پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں (البقرہ: ۱۶۴)[5] اور اس غور و فکر کے نتیجے میں تحقیق و تفصیل کے دروازے کھلتے ہیں۔ محقق ان مظاہرِ الٰہیہ کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے تجرباتی و نظری کاوشیں کرتا ہے۔ مزید برآں قرآن انسان کو تسخیرِ کائنات کے لیے

---

۱ مزید دیکھئے الاعراف ۲ - النحل ۴۴ - محمد ۲

۲ ابن ماجہ، بیہقی فی شعب الایمان

۳ بخاری شریف

۴ ترمذی، دارمی

۵ مزید دیکھئے آل عمران ۱۹۰، ۱۹۱ - الاعراف ۱۸۵ - حم السجدہ ۵۳، ۵۴ - الذاریات ۲۰ تا ۲۳ وغیرہ

ابھارتا ہے (النحل: ۱۲ - لقمان: ۲۰) جس کا لازمی تقاضا کائناتی علوم کے حصول و فروغ کی تحریک فراہم کرتا ہے۔ قرآن انسانی و کائناتی علوم کے حصول و فروغ پر کس طرح ابھارتا ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں غور و فکر کی دعوت دینے والی سات سو پچاس آیات ہیں جب کہ احکام و قوانین کے متعلق آیات تقریباً ایک سو پچاس ہیں۔ قرآن انسان اور کائنات سے متعلق علوم کی کس طرح ترغیب دیتا ہے اس کا اندازہ ان آیات سے ہو سکتا ہے۔[1] اس طرح کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن جملہ کائناتی اور انسانی علوم کے حاصل کرنے اور ان کو پھیلانے پر ابھارتا ہے۔

اسی قرآنی تحریک کا نتیجہ تھا کہ حاملینِ قرآن نے اپنے دورِ عروج میں علمی سیادت و امامت کا لوہا منوا لیا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ تیرہویں صدی کا سائنسی اور صنعتی انقلاب قرآن نے غور و فکر اور تدبر کی جو تحریک برپا کی تھی اسی کا مرہونِ منت ہے۔ اس کا اعتراف انگریز مصنف بریفالٹ نے یوں کیا ہے کہ:

"جدید دنیا پر عربی تہذیب نے سب سے بڑا احسان کیا ہے۔ اگرچہ اس کے ثمرات ذرا دیر سے سامنے آئے۔ اسپین میں عربی ثقافت نے جس عبقریت کو جنم دیا تھا وہ اس تہذیب کے روپوش ہونے کے کافی عرصہ بعد جلوہ گر ہوئی۔ صرف علم KNOWLEDGES SCIENCE ہی نے یورپ کو زندگی نہیں بخشی بلکہ اسلامی تہذیب کے اور بھی بہت سے مؤثرات نے اپنی ابتدائی کرنیں مغربی زندگی پر ڈالی ہیں۔ یورپی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا مرجع یقینی طور پر اسلامی ثقافت کے مؤثرات نہ ہوں۔ یہ مؤثرات نہایت وضاحت اور اہمیت کے ساتھ جدید دنیا کی تشکیل کرتے ہیں اور جدید دنیا کی قوت یعنی صحیح علوم اور بحث کے علمی انداز پر اثر انداز ہوتے ہیں۔"[2]

---

۱ ملاحظہ ہوں آیات یونس: ۱۰۱ - الذاریات: ۲۰، ۲۱ - یوسف: ۱۰۸ - الروم: ۲۲
فاطر: ۳۵: ۴۴ - روم: ۹

۲ MAKING OF HUMANITY

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یورپ کے سائنسی انقلاب کے پیچھے بہت سے منفی اور غیر اسلامی محرکات بھی موجود تھے۔ ان کے غیر فطری پہلوؤں اور تخریبی نتائج کی ذمہ داری اسلام پر کسی طرح عائد نہیں ہوتی۔

محکمات، متشابہات اور علم غیب

قرآن دو قسم کی آیات کا ذکر کرتا ہے۔ آیات محکمات اور آیات متشابہات (آل عمران: ۷) آیات محکمات کتاب کی بنیاد ہیں۔ ان کو قرآن "ام الکتاب" سے تعبیر کرتا ہے۔ ان کے معانی و مفاہیم واضح ہیں جبکہ متشابہات ان حقائق کو کہا جاتا ہے جن کے صحیح معانی و مفاہیم انسان کو معلوم نہیں اور نہ وہ ان کی حقیقت معلوم کر سکتا ہے۔ ان کی حقیقت کُلی صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ (آل عمران: ۷) متشابہات کے ضمن میں جنت، دوزخ اور خود ذات باری تعالیٰ وغیرہ کی حقیقت آتی ہے۔ قرآن کی رو سے ایسے علوم و آیات کی حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش ضیاع وقت، زیغ قلب اور فتنہ کو دعوت دینے والی ہے (آل عمران: ۷) مثلاً قرآن اللہ کی سلطنت اور لامتناہی قدرت کاملہ کے اظہار کے لئے عرش (المؤمنون: ۹) کرسی (البقرہ: ۵۵) اللہ کا ہاتھ (فتح: ۱۰۔ ص: ۷۵) وغیرہ کا ذکر آیا ہے جب کہ قرآن ہی ذات باری تعالیٰ کے لئے احد (اخلاص: ۱) صمد (اخلاص: ۲) لیس کمثلہ شیئ (الشوریٰ: ۱۱) جیسی صفات بھی بیان کرتا ہے۔ ان صفات سے اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا تصور بنتا ہے جو جسم و مکان سے منزہ، ستودہ صفات، قائم بالذات اور ازلی و ابدی ہے۔ ظاہر ہے ایک ایسی ذات کی حقیقت وہ کیسے جان سکتا ہے جس کا خود اس کو تجربہ نہیں اور جس کی مثل کوئی دوسری شے اس کائنات ہی میں نہیں ہے۔

قرآن مجید انسان سے غیب پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ کوئی قابل اعتراض مطالبہ نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہر علم کی بنیاد میں، دو اصول ناقابل مشاہدہ مسلّمہ (AXIOMS) بنا کر رکھی جاتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ علم مشاہدہ کی سب سے بڑی علمبردار اور مادیت کی پروردہ سائنس بھی ان دیکھے الیکٹران، پروٹان، ایٹم اور بہت سے خیالی ذرات پر اپنی بنیاد رکھتی ہے چاہے ان پر ایمان لانے کا دعویٰ نہ کرتی ہو۔ ڈالٹن کا ایٹمی نظریہ آج سے تقریباً دو سو سال قبل معرض وجود میں آیا جب کہ ایٹم پر کسی قسم کا مشاہدہ تو درکنار تجربہ بھی نہیں

ہو سکتا تھا مگر اس ان دیکھی حقیقت کو مانتے ہوئے سائنس داں تجربات و تحقیقات کرتے رہے اور مادی سائنس کو موجودہ دور عروج تک لے آئے اور نہ صرف ایٹم کو منوا لیا بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر بنیادی نظریۂ ڈالٹن کے خلاف ایٹم کو توڑ کر اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا۔ اگر ایٹم پر براہ راست تجربہ کا انتظار کیا جاتا تو سائنس آج سو برس پیچھے ہوتی بلکہ شکوک و شبہات میں الجھنے کی وجہ سے اس مقام تک بھی نہ پہونچ پاتی۔ یہ عروج سائنس صرف ان دیکھی بنیادوں کی روشنی میں آگے بڑھتے رہنے کے طفیل ہوا۔[1] اس تفصیلی بحث سے واضح ہو گیا کہ علوم کی گہرائی و وسعت حاصل کرنے کے لئے غیب پر ایمان اور متشابہات کے ذریعہ حقائق محکم کی آبیاری کی جاتی ہے کیونکہ غیبی علوم بنیاد فراہم کرتے ہیں اور متشابہات سے حقیقت سے قریب پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

علم، تفقہ، حکمت اور ہدایت کا تعلق

قرآن مجید نے علم کے تعلق سے تفقہ (التوبہ: ۱۲۲) حکمت (البقرہ: ۱۵۱)[2] اور ہدیٰ (لقمان: ۲۰ ......) وغیرہ کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ علوم کی گہرائی اور بصیرت کے لئے عموماً تفقہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ حکمت علوم کے ان اسرار و رموز سے عبارت ہے جس کے ذریعہ مومن جملہ امور دنیوی و دینی بشمول خالق کائنات کے مصالح و مقاصد سے بہرہ ور ہوتا ہے جس سے منجملہ دوسری خصوصیات کے اس میں شکر خداوندی کا داعیہ پیدا ہوتا ہے (لقمان: ۲)۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی صفت کی حیثیت سے لفظ "حکمت" قرآن میں جا بجا دہرایا گیا ہے (البقرہ: ۱۲۹)[3] اور رسولوں کی بعثت کا ایک اہم مقصد منجملہ دوسرے مقاصد کے حکمت کی تعلیم دینا بھی مقصود دیا گیا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کے مضمون بعنوان "تحقیقی ترقی کے اسباب اور اسلام" ماہنامہ برہان، دہلی، اکتوبر۔ نومبر ۱۹۸۲ء میں علم غیب کی بحث۔

[2] مزید دیکھئے آل عمران: ۱۶۴، بنی اسرائیل: ۳۹، الاحزاب: ۳۴، جمعہ: ۲۔

[3] مزید دیکھئے آل عمران: ۴۸، النساء: ۵۴، المائدہ: ۱۱۰

(البقرہ: ۱۵۱[1]) اس مقصد بعثت سے یہ امر بھی مترشح ہوتا ہے کہ رسولوں کو نہ صرف علمِ کتاب سے نوازا جاتا ہے بلکہ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ ان پر ان حکمتوں کو بھی واضح کرتا ہے جو منصب رسالت سے متعلق ہیں۔ حکمت کی اہمیت کا اندازہ اس آیت سے ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک حکمت اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے اور جس کو حکمت سے نوازا گیا اس کو "خیر کثیر" سے نوازا گیا۔ (البقرہ: ۲۶۹) کہ یہاں "خیر کثیر" علم سے آگے صفت حکمت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جملہ علوم کے محققین کائناتِ عالم کی حکمتوں کی نقاب کشائی کے لئے ہی اپنی تحقیق کا آغاز کرتے ہیں مگر توفیق خداوندی اور اس کے لئے طلب نہ ہو تو انسان ان حکمتوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اور راستے کی درمیانی منازل ہی کو حکمتِ اصلی سمجھ بیٹھتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکمتیں انسان کے قلب میں تبھی آشکارا ہوتی ہیں جب کہ وہ ایمان لا کر علوم متعلقہ میں بصیرت حاصل کرے اور گہرا غور نیز تجربات وغیرہ کے بعد خود و نیز کے ذریعہ کائنات میں کارفرما مصالح و مقاصد کو جاننے کی کوشش کرے۔

ہدایت اللہ تعالیٰ کی اس رہنمائی سے عبارت ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی حقیقت، کائنات کی حقیقت، کائنات و انسان کی تخلیق کا مقصد اور کائنات میں انسان کی حیثیت اور اپنے انجام کا علم یقینی طور پر حاصل کر لیتا ہے اور اس کی روشنی میں منازل حیات طے کرنے لگتا ہے۔ قرآن کی رو سے ہدایت کا منبع صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ (البقرہ: ۱۴۲، ۲۷۲) اور یہ اللہ تعالیٰ کا کرم خصوصی ہے کہ جس کو چاہتا ہے عنایت کرتا ہے مگر ہدایت بھی مانگے بغیر نہیں ملتی۔ چنانچہ انسان کے سلیم الفطرت ہونے کی سب سے بڑی نشانی قرآن کی رو سے یہ ہے کہ ہدایت کی طلب اس کے قلب میں پائی جائے اور وہ اپنے معبود حقیقی سے اس معاملہ میں استعانت طلب کرے تبھی اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا خصوصی فیضان ہوتا ہے۔ اس کو قرآن "صراطِ مستقیم" (الفاتحہ: ۵[2]) ہدایت (البقرہ: ۵[3]) اور ایمان (الصّٰفّٰت: ۱۱۱، ۱۲۲) وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس

۱؎ مزید دیکھئے آل عمران ۱۶۴، الجمعہ ۲ ۲؎ مزید دیکھئے آل عمران ۱۰۱، الانعام ۸۲، یونس ۶۱، الصّٰفّٰت ۱۱۸، الحج ۵۴ ۳؎ مزید دیکھئے الانعام ۷۱، الحدید ۹، الطلاق ۱۱

علم ہدایت کو منبع ہدایت سے براہ راست انبیاء کرام اخذ کرتے ہیں (الانعام: ۸۹، ۹۰) اور وہ آیات و بینات اور جب واضح کر دالے کے ذریعہ عام لوگوں پر اپنے حامل نبوت و ہدایت ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اکثر لوگ ضد اور تعصب کی وجہ سے علم ہدایت کی روشنی سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور کچھ لوگ اپنے علم دنیا پر نازاں رہتے ہیں اور خود کو علم ہدایت سے بے نیاز سمجھ کر غیر انسانی یعنی غیر اسلامی زندگی گزارنے پر اصرار کرتے ہیں اور نتیجۃً عذاب دنیا کی پکڑ میں بھی آ جاتے ہیں۔ (القصص ۷۷، ۸۱)

علوم کی اسلامائیزیشن کی ضرورت

قرآن کی رو سے علم کے ہر شعبہ کو اسلامی خطوط پر استوار کرنا اس لئے ضروری ہے کہ جملہ علوم دنیوی، علمِ وحی کے فیضان کے بغیر انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں (الاعراف ۱۴۳) طاغوت کے ہاتھوں میں علم و ہنر ہو تو وہ انسانیت کو تباہی و بربادی سے ہمکنار کر دیتا ہے اسلام کی نظر میں وہی علم صحیح ہے جو انسان اور انسانیت کے لئے نافع ہو (البقرہ: ۱۰۲، المؤمن: ۸۳)۔ آج دنیائے انسانیت کو اسی نافع علم و ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے جس سے دنیا پر منڈلاتے ہوئے جنگ کے سیاہ بادل چھٹیں اور کراہتی انسانیت، ظلم و بربریت کے مارے ہوئے عوام، افلاس اور امراض و مصائب سے دوچار اقوام، ترقی کے نام پر تنزل کی طرف گامزن دنیا، غیر متوازن و غیر اخلاقی زندگی، بہیمیت و عریانیت اور راحت پسندی کا دلدادہ معاشرہ، خود غرضی و بد عملی پر استوار سماج کی جگہ اخلاقی بنیادوں پر استوار معاشرہ، سکون و چین سے مہکتا ماحول، ستاروں سے آگے کے جہانوں کی جستجو کا جذبہ، حقیقی ترقی، عدل و مساوات، اخوت و ایثار، حریت و جوانمردی جیسی صفات پر مشتمل سماج انسانی کی تشکیل نو ہو۔

آج وقت کی اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ جملہ دنیوی علوم و فنون خصوصاً سائنس و ٹیکنالوجی کو اسلام کے سانچے میں ڈھال کر حقیقی ترقی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جائے ورنہ آج کے علوم و فنون کی موجودہ سمت تو انسانی تہذیب و تمدن کو تباہی اور تخریب کی منزل تک پہنچائے بغیر دم نہ لے گی اور حقیقی ترقی تو کجا مادی ترقی بھی ختم ہو جائے گی۔

(شکریہ: ترجمان القرآن، ۹ جون)

دورِ جدید کے مسائل اور ان کا حل

ترجمانی: محمد اسماعیل فلاحی

علمی تحقیقات اور افتاء کی غرض سے سعودی عرب میں "ہیئۃ کبار العلماء" نامی جلیل القدر علماء کا ایک فعال و سرگرم بورڈ ہے جس کے صدر سعودی عرب کے مشہور محدث وفقیہ اور زبردست عالم دین شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز ہیں۔ عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے بے شمار معاملات میں اس بورڈ نے فتوے دیئے ہیں اور لوگوں کی رہنمائی کی ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ انہی فتووں پر مشتمل ایک مجموعہ کتابی شکل میں پانچ جلدوں میں منظر عام پر آیا ہے جس کا نام ہے "فتاوی ہیئۃ کبار العلماء" اور جس کو شیخ صفوت الشوادفی نے مرتب کیا ہے۔ ہم مذکورہ فتوی بورڈ کے شکریہ کے ساتھ بعض فتووں کا ترجمہ نذر قارئین کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ (ادارہ)

فتوی نمبر ۱۶۲۰ ؛ تاریخ ۱۱/۷/۱۳۹۷ھ

سوال:۔ بہت سے مسلمان ملکوں میں جیکٹ، پتلون، کبھی صرف پتلون شرٹ یا پتلون اور فل ٹی شرٹ یا موسم گرما میں ہاف ٹی شرٹ پہننے کا عام رواج ہو گیا ہے۔ کیا یہ غیر مسلموں سے مشابہت اختیار کرنے کے ذیل میں آتا ہے یا نہیں؟

جواب:۔ چونکہ لباس کا تعلق عادات سے ہے اس وجہ سے اصلاً اس کی تمام اقسام جائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق" (کہہ دو کس نے اپنے بندوں کے لئے اللہ کی نازل کردہ زینت اور پاکیزہ

رزق کو حرام قرار دیا ہے؟)

اس سے مستثنیٰ وہی لباس ہوں گے جن کی تحریم یا کراہت پر کوئی دلیل شرعی موجود ہو۔ چنانچہ مردوں کے لئے ریشم ممنوع ہوگا اور ایسا کپڑا جائز نہ ہوگا جو اتنا باریک ہو کر ستر کو نمایاں کر رہا ہو اور جسم کی رنگت کا پتہ دے رہا ہو یا اتنا تنگ ہو کر ستر کی حد بندی کرتا ہو۔ اس لئے کہ ایسا لباس ستر کو بجائے ڈھکنے کے اور نمایاں کرتا ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح وہ ملبوسات جن سے بہت سی غیر مسلم قومیں جانی پہچانی جاتی ہیں ان کا پہننا نہ عورتوں کے لئے جائز ہے اور نہ مردوں کے لئے درست ہے کیونکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی مشابہت اختیار کرنے سے روکا ہے۔ اسیطرح مردوں کے لئے عورتوں کا لباس زیب تن کرنا اور عورتوں کے لئے مردوں کا لباس پہننا جائز نہیں ہے کیونکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔

جہاں تک شرٹ اور پتلون کا سوال ہے تو اس کا استعمال کفار کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ بہت سے ملکوں اور ریاستوں میں یہ مسلمانوں اور کافروں دونوں کے درمیان عام ہے۔ بعض علاقوں میں لوگوں کو اس سے کراہت محض اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ لوگ اس سے مانوس نہیں ہیں اسلئے کہ اس ملک کے لوگ اس لباس کو استعمال نہیں کرتے حالانکہ دوسری جگہوں کے مسلمانوں میں یہی لباس رائج ہے۔

ہاں اگر کوئی مسلمان ایسے ملک میں رہتا ہو جہاں کے لوگ اس لباس کو عادتاً استعمال نہیں کرتے تو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ اس لباس کو نماز میں، عام مجلسوں اور راستوں میں استعمال نہ کرے۔

سوال:۔ اوپر مذکور لباس یعنی جیکٹ اور پتلون میں نماز ہوگی یا نہیں؟

جواب:۔ اگر مذکورہ لباس اتنا کشادہ ہے کہ اس سے ستر کی حد بندی نہیں ہوتی اور اتنا دبیز ہے کہ اس سے ستر نہیں جھلکتا، تو اس میں نماز ہو جائے گی اور اگر اتنا باریک ہے کہ ستر ڈھانپنے کے بجائے ستر کو نمایاں کرتا ہے اور پہننے کے باوجود ستر نظر آتا ہے تو اس میں نماز

باعث ہوگی اور تنگ ہونے کی وجہ سے ستر کی صرف حد بندی کرتا ہو تو نماز مکروہ ہوگی اِلّا یہ کہ اس کے پاس دوسرا لباس موجود نہ ہو۔

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

فتویٰ نمبر ۲۸۲۸ ۔ تاریخ ۱۸ / ۲ / ۱۴۰۱ھ

سوال:۔ ایک شخص لکھتا ہے کہ وہ دس سالوں سے ایک بینک میں ملازم ہے اسے معلوم ہے کہ بینک میں کام جائز نہیں ہے۔ وہ صرف رات میں پہرے داری کرتا ہے اور لین دین وغیرہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ کیا وہ بینک میں اپنی ڈیوٹی بدستور انجام دیتا رہے یا اسے چھوڑ دے؟

جواب:۔ وہ بینک جو سودی لین دین کرتے ہیں ان میں کسی مسلمان کا پہرہ دار بننا جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے گناہ اور تعدی کے کام میں تعاون ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا ہے۔ فرمایا: ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ (سورۂ مائدہ) ترجمہ:۔ گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو۔

بینکوں میں اکثر وبیشتر سودی لین دین ہوتا ہے۔ اس وجہ سے آپ کے لئے مناسب بات یہ ہے کہ طلب رزق کے حلال طریقے تلاش کریں اور اس طریقے کو چھوڑ دیں۔

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ

فتویٰ نمبر ۶۷۷۹ ۔ تاریخ ۲۹ / ۳ / ۱۴۰۴ھ

سوال:۔ سلام کے وقت کسی مسلمان کے آگے سر جھکانا کیسا ہے؟

جواب:۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا سر مسلمان یا کافر کسی کے آگے سلام کرنے کے لئے جھکائے۔ اس لئے کہ عجمی اپنے بڑوں کے لئے ایسا کرتے ہیں اور اس لئے بھی کہ یہ حرکت رکوع کے مشابہ ہے اور رکوع ایسا سلام اور تعظیم ہے جو اللہ کے علاوہ کسی کے لئے صحیح نہیں ہے۔

فتویٰ نمبر ۳۱۲۷ ۔ تاریخ ۱۱ / ۱۱ / ۱۴۰۱ھ

سوال:۔ عورت کے کام کرنے کا کیا حکم ہے؟ نیز اس کا دائرہ کار کیا ہے؟

جواب:۔ اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عورت کو کام کرنا چاہئے۔ البتہ کلام اس میں ہے کہ وہ کون سے میدان کار ہیں جن میں وہ کام کرے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عورت وہ سارے کام کرے گی جو دیگر خواتین اپنے شوہر والے یہاں یا اپنے گھر اور خاندان میں کیا کرتی ہیں مثلاً کھانا پکانا، آٹا گوندھنا، روٹی بنانا، جھاڑو دینا، کپڑے دھونا نیز خدمت اور باہمی تعاون کے وہ سارے کام انجام دے گی جو گھر اور خاندان میں اس کے مناسب حال ہوں گے۔ نیز اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ تدریس کا فریضہ انجام دے، خرید وفروخت کرے اور بنائی، رنگائی، کتائی اور سلائی وغیرہ جیسے کاموں کو انجام دے بشرطیکہ ان چیزوں کا ارتکاب نہ ہو جو شرعی حیثیت سے ناجائز ہیں مثلاً غیر شخص کے ساتھ تنہائی میں رہنا یا ملنا جلنا یا غیر محرم مردوں کے ساتھ ایسا میل جول جو کسی فتنہ کا سبب بنے یا ان کاموں میں مشغول ہونے کی وجہ سے خاندان کے تئیں عورت کے اوپر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ ادا نہ ہو رہی ہوں اور کوئی دوسرا شخص بھی ادا کر رہا ہو نیز اس کام کے سلسلے میں گھر والے راضی نہ ہوں۔

مذکورہ بالا ساری صورتوں میں عورت کا گھر کے باہر کے کاموں کو انجام دینا درست نہیں ہے اور اگر مذکورہ باتوں کا پاس ولحاظ ہو سکے تو عورت گھر کے باہر کے کاموں کو بھی انجام دے سکتی ہے۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم

فتویٰ نمبر ۱۹۰۰ ۔ تاریخ ۱ / ۵ / ۱۳۹۸ھ

سوال:۔ شعر، گانا اور موسیقی کا حکم کیا ہے اور اس کو سننا کیسا ہے اور اس کے سننے والے کی نماز مقبول ہوتی ہے یا باطل؟

جواب:۔ شعر کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض اشعار میں حکمت کی باتیں، عمدہ نصیحتیں، حق کا دفاع، کسی باطل کا ابطال یا اسی طرح نیکی کی تبلیغ کی دوسری چیزیں ہوتی ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے اشعار ٹھیک ہیں اور جن میں جھوٹ، باطل کی حمایت، کسی حق کا ابطال، شرپسندوں کی مدح وستائش

یا نیک لوگوں کی مذمت یا اسی قبیل کی دوسری چیزیں بیان ہوں ایسے اشعار سراسر شر ہیں۔ جہاں تک گانے، موسیقی اور ان کے سننے کی بات ہے تو ان کے منکرات ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

گانا اور موسیقی سننے والے کی نماز باطل نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ اس کے ارکان، واجبات و شرائط کو اسی طرح پورا کرتا ہو جس طرح سے اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے، امید ہے کہ اسکی نماز قبول ہو جائیگی لیکن یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ قبولیت و عدم قبولیت کا علم امور غیب میں سے ہے۔ اللہ کے علاوہ انھیں کوئی نہیں جانتا۔ لہذا مسلمان پر واجب ہے کہ گانا موسیقی اور ان کا سننا ترک کردے۔ نماز، تقرب الٰہی کے دوسرے کام اور دیگر عبادتوں کی محافظت کرے اور اللہ سے اپنے عمل کی قبولیت اور گناہوں و خطاؤں کی معافی کی امید رکھے۔

فتویٰ نمبر ۵۱۵۶ - تاریخ ۲۳/۱۲/۱۴۰۲ھ

سوال :- انسان ہوائی جہاز میں ایک لمبی مسافت دو گھنٹہ یا اس سے بھی کم وقت میں طے کرتا ہے۔ کیا ایسا شخص نماز قصر کریگا اور رمضان کا روزہ نہیں رکھے گا؟ اسی طرح سے ایک شخص بس میں تقریباً دو سو میل یا اس سے بھی زیادہ ڈھائی گھنٹے میں سفر کر لیتا ہے اور شام میں اپنے گھر واپس آجاتا ہے اور نماز قصر کرتا اور کہتا ہے یہ اللہ کی طرف سے ہدیہ ہے اسکے ہدیہ کو قبول کرو۔ کیا یہ قصر جائز ہے یا قصر صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں جبکہ سفر میں مشقت اور تھکاوٹ وغیرہ ہو؟

جواب :- مذکورہ بالا مسافت میں نماز قصر کرنا سنت ہے۔ اسی طرح اتنی لمبی مسافت طے کرنے والے شخص کے لئے روزہ کے سلسلہ میں بھی رخصت ہے خواہ مسافر نے مسافت زیادہ وقت میں طے کی ہو یا کم وقت میں۔ سفر ایک گھنٹہ میں طے ہوا ہو یا اس سے کم یا زیادہ میں۔ سفر میں خواہ مشقت اٹھائی ہو یا نہ اٹھائی ہو۔ سفر میں مشقت اور پریشانی ہو سکتی ہے اگرچہ بالفعل ایسا نہ ہوا ہو اور یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر خاص فضل اور رحمت ہے۔

ان سب فتاویٰ کے آخر میں مجلس تحقیقات علمی و افتاء کے دائمی بورڈ کے درج ذیل ذمہ داروں کے نام ہیں:

ممبر:- عبد اللہ بن قعود، عبد اللہ بن غدیان۔ نائب صدر بورڈ:- عبد الرزاق عفیفی

صدر بورڈ:- شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز

رپورٹ کارروائی شوریٰ انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

۹؍ دسمبر ۱۹۹۰ء کو دوپہر ڈیڑھ بجے سے انجمن کی شوریٰ کا اجلاس صدر انجمن جناب نسیم احمد غازی کی صدارت میں شروع ہوا جو رات گئے تک جاری رہا۔ اس اجلاس میں صدر انجمن کے علاوہ جناب عزت اثری صاحب فلاحی، جناب محمد عمران صاحب فلاحی، جناب انصار احمد صاحب فلاحی، جناب شبیر احمد صاحب فلاحی، جناب قائد حامدی صاحب فلاحی، جناب مقبول احمد صاحب فلاحی، جناب معین الدین صاحب فلاحی اور جاوید اشرف فلاحی شریک ہوئے۔

کارروائی کا آغاز صدر انجمن نے اپنے افتتاحی کلمات سے کیا جس کے بعد شوریٰ کی گزشتہ کارروائی کی خواندگی ہوئی اور اس کا جائزہ لیا گیا، تعلیم و تربیت کی موجودہ صورت حال پر غور کیا گیا اور اس کے معیار کو بلند کرنے کے معاملہ میں مختلف مسائل زیر بحث آئے۔

اس کے علاوہ بھی کچھ اہم فیصلے حسب ذیل ہیں:

۱- قائد حامدی صاحب نے دستور انجمن میں ترمیمی سفارشات پیش کیں جن پر غور کیا گیا اور بعض تبدیلیوں کے ساتھ شوریٰ نے انھیں منظور کر لیا اور فیصلہ ہوا کہ اب انھیں عام ممبران انجمن کے پاس بھیجا جائے تاکہ اس سلسلہ میں ان کی رائیں آجائیں۔ انشاء اللہ عنقریب انھیں یہ سفارشات بھیج دی جائیں گی۔

۲- "حیات نو" کی توسیع اشاعت کیلئے ولی اللہ سعیدی صاحب بھوپال دورہ کریںگے نیز حافظ محمد اسمٰعیل صاحب "حیات نو" کی ترتیب، کتابت اور طباعت وغیرہ کا کام انجام دیں گے۔

۳- نور محمد صاحب فلاحی کے بیرون ملک ہونے کی وجہ سے ان کی عدم موجودگی میں اظہار احمد صاحب فلاحی بحیثیت خازن کام کریں گے اور ان کی موجودگی میں ان کی معاونت کریں گے۔

آخر میں دعا پر اس اجلاس کا اختتام ہوا۔

جاوید اشرف فلاحی
سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم

نعتِ پاکؐ

قمرؔ —— رسولپوری

فضائے قدس کی آب و ہوا کتنی معطر ہے
ابھی اب تک شمیمِ نکہتِ زلفِ پیمبر ہے

بہت پہلے کیا تعمیر ابراہیمؑ نے جس کو
وہی اب ہے قبلۂ عالم، وہی اللہ کا گھر ہے

عبث مجھ کو دکھائی جا رہی ہے رونقِ دنیا
مدینے کی زمیں میرے لئے ہر شے سے بڑھ کر ہے

بہ اندازِ گدایانہ کھڑے ہیں تیری چوکھٹ پر
زمانے کا ہے کوئی تاجور، کوئی سکندر ہے

خدا کا نور اترا تھا جو عبداللہ کے گھر میں
اسی کی روشنی سے محفلِ ہستی منور ہے

چلا ہے ابرہہ سوئے حرم کچھ غم نہیں ہم کو
مدد کے واسطے اب بھی ابابیلوں کا لشکر ہے

اطاعت ہم سے غیر اللہ کی ہرگز ہو ناممکن
ہمیں اللہ کا ڈر ہے ہمیں اللہ کا ڈر ہے

فرشتے آسماں کے ناز برداری کریں جس کی
قمرؔ یہ مرتبہ محبوبِ داور کو میسر ہے

ہمارا وطن

از شیخ منصفؔ مبارکپوری

امن گاہِ عام تھی جو وادیٔ گنگ و جمن
ہے وہی باغ و بہارِ زندگی اپنا وطن

ہم ہیں پیغامِ اماں ہندوستاں میں آج بھی
ہم ہیں بلبل، ہم ہیں قمری، ہم ہیں ریحانِ وطن

آج گو ہے گلشنِ ظلم و ستم ہندوستاں
تھا یہی دورِ مسلماں میں اک دلکش چمن

پی کے بدمستی کی مے سب ڈگمگائے جو تم مگر
آج بھی ہم ہی ہیں تعمیرِ وطن کی اک کرن

تم نے دیکھی ہی نہیں ہے شوکتِ مسلم کی شان
صفحۂ تاریخ سے روشن ہے جس کا بانکپن

چوکڑی بھولا ہے آہو، خوف سے پنجاب کے
ہم ہیں مسلم، امن و احساں ہے ہمارا علم و فن

ہو نہیں سکتے برابر، پلۂ میزان میں
قطرۂ اشکِ ندامت، سرجو و گنگ و جمن

آتشِ نخوت والے بت جو آج سب کچھ بھی نہیں
ہے تری ہر بات ادائے روح فرسا، دل شکن

جب سے حائل ہند و مسلم میں کینہ ہو گیا
لگ رہا ہے ہند کے سورج کو اے منصفؔ گہن

زبان وادب کی ترقی میں قرآن کا رول

توقیر عالم فلاحی۔ ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قرآنی ادب کی چند جھلکیاں

قرآن مجید نے چونکہ اپنی انقلابی تعلیمات کے ذریعہ انسانیت سازی کا علم بلند کیا، ذہنوں کی گرہیں کھول دیں، تعصب وعداوت کی چنگاریوں کو ختم کر دیا، اخوت ومحبت کا بیج بو دیا اور اس طرح زندگی کے جملہ معاملات پر حق وصداقت کی ضیاء پاشیوں کے ساتھ ہی ساتھ ادب وثقافت نے بھی پورے طور پر اس کی روشن شعاعیں قبول کیں۔ قرآن کی اس وسعت وہمہ گیریت کے پیش نظر صرف نمونے کے طور پر قرآن پاک کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں جو ایک طرف تو دلوں کی دنیا میں حق وصداقت اور وحدت الٰہی کا منبع ہوتی ہیں اور دوسری طرف عربی زبان وادب کو ایجاز واختصار، تشبیہ وتمثیل اور حذف واضافہ کے باب میں روشن جزئیات سے کرفن کو نئی جستجو سے روشناس کرتی ہیں۔

قرآن مجید قصاص کی حکمت بتاتے ہوئے گویا ہے:

ولکم في القصاص حياة۔ [١٠] قانون قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ایک انسان کا بے جا قتل شرانگیزی وفساد کاری کا پیش خیمہ ہے اس لئے کہ انسانی جان کا احترام پامال ہوتا ہے۔ اس پر گرفت ومواخذہ نہ کرنے سے دوسروں کے اس قسم کے مذموم جذبات کو شہ ملتی ہے اور پھر انسانی قتل وغارت گری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اسی قانون قصاص کی موافقت ومخالفت میں ہزار ہا کتابیں اور مقالات لائبریریوں کی زینت بن گئے لیکن شافی اور مسکت جواب سے مخالفین قصاص کو مطمئن نہیں کیا گیا۔ قرآن چند الفاظ میں فلسفۂ قصاص کو اتنے حسین اور دلکش پیرایۂ بیان میں واضح کرتا ہے کہ مخالفین وموافقین اپنی بے بضاعتی کا احساس کرتے ہوئے

قرآنی وضاحت کے سامنے سر طاعت جھکا دیتے ہیں۔

قرآن سورہ شعراء میں دلوں پر عبودیت وسرافگندگی کا سکہ بٹھاتے ہوئے ابراہیمؑ کی زبان سے پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے:

الذي خلقني فهو يهدين ۔ والذي هو يطعمني ويسقين ۔ واذا مرضت فهو يشفين ۔ والذي يميتني ثم يحيين ۔ [١١]	(پوری کائنات کا رب) وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے پس وہی مجھے ہدایت دے گا۔ (رب العالمین) وہ ہے جو مجھے کھلاتا اور سیراب کرتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے اور (رب کائنات) وہ ہے جو مجھے مارتا ہے اور پھر وہی زندہ کرتا ہے۔

یہاں بھی چند الفاظ ہیں جو خالص دعوت توحید پر مشتمل ہیں جو فکر ونظر کو تبدیل کر کے اور دلوں میں وحدت خداوندی کا تصور تعمیر کر کے انسانی ضابطۂ حیات کی تشکیل نو پر تحریض کرتا ہے۔ پھر ان آیات کے اندر اسلوب بیان کی لطافت، جملوں کی بندش، سلاست وروانی اور ایجاز واختصار کا دریا موجزن ہے جو انسانی زاویۂ فکر کو بدلنے کے لئے معجزے کا کام کرتا ہے۔

کچھ اور آیات قرآنی دیکھی جائیں فرمایا گیا:

ونفخ في الصور فصعق من في السموات ومن في الارض الا من شاء الله ثم نفخ فيه اخرى فاذا هم قيام ينظرون۔ [١٢]

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

واشرقت الارض بنور ربها ووضع الكتاب وجيء بالنبيين والشهداء وقضي بينهم بالحق وهم لا يظلمون [١٣]

سورۂ زمر ہی میں کفار کے عذاب اور ان کی ذلت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وسيق الذين كفروا الى جهنم زمرا حتى اذا جاؤها فتحت ابوابها وقال لهم خزنتها الم ياتكم رسل منكم يتلون عليكم آيات ربكم وينذرونكم لقاء يومكم هذا ۔ قالوا بلى ولكن حقت كلمة العذاب

علی الکافرین۔ [۱۲]

کافروں کو جھنڈ در جھنڈ جہنم کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ جہنم کے پاس آئیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور جہنم کے داروغے ان سے پوچھیں گے تمہارے ہی اندر سے رسول نہیں آئے جو تمہارے رب کی آیات کو تمہیں پڑھ کر سناتے اور تمہیں آج کے دن سے سابقہ پیش آنے کے سلسلے میں ڈراتے۔ وہ لوگ کہیں گے کیوں نہیں (وہ ضرور آئے) لیکن کافروں پر کلمۂ عذاب ہی ثابت ہو کر رہا۔

مذکورہ بالا قرآنی آیات کے مطالعہ کے بعد یہ بات اب تشنۂ وضاحت نہیں رہتی کہ قرآن پاک خواہ توحید و رسالت اور آخرت کی تعلیم دے رہا ہو۔ اقوام بائدہ کی ہلاکت و بربادی پر تبصرہ کر رہا ہو یا فلسفۂ زندگی کے رموز و اسرار بتا رہا ہو ہر جگہ اور ہر حصہ بلاغت کی چاشنی لئے ہے۔ شوقی ضیف کے بقول یہ کتاب خواہ کہیں اللہ واحد کی عبادت و پرستش کی دعوت دے رہی ہو اور اس کی عظمت و جلال کو واضح کر رہی ہو یا آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق پر گفتگو کر رہی ہو یا پھر آخرت اور حشر و نشر کے حقائق سے روشناس کرا رہی ہو۔ اس کا ہر پہلو قرآن کی فصاحت و بلاغت پر ناطق ہے۔ [۱۵]

زبان و ادب پر قرآن کریم کے اثرات

قرآن کا اسلوب دعوت نرالا ہے۔ جس دین اور جس ضابطۂ زندگی کی طرف دعوت دیتا ہے وہ انسانیت کے تمام ساختہ ادیان سے پرے اور مافوق ہے جس کی اتباع و تقلید کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈالنے کے بعد فلاح و سعادت سے ہمکنار ہوا جا سکتا ہے۔ یہ قرآن کے اتباع کا دینی پہلو ہے۔ لیکن جیسا کہ گزشتہ مباحث میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قرآن اپنی نمایاں ترین خصوصیات کی بنا پر ادبا و فصحاء کی لسانی غلطیوں کی اصلاح و تصحیح کا ذریعہ بڑا ثمر آور ثابت ہوا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم دین و مذہب اور ادب و ثقافت کے لحاظ سے قرآن کی اثر آفرینی کے ہر جہت پہلو کو مستحضر رکھیں گے تبھی قرآن کے معجز کلام ہونے کی اصل حیثیت نکھر کر آ سکے گی۔ قرآن کی اثر انگیزی کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ دشمن بھی اس کے ذہن و دماغ کے کانٹے پلٹ جاتے تھے۔ روایت ہے کہ ولید بن مغیرہ

جو شدید ترین مخالفین دعوت میں سے تھا جب اس نے قرآن حکیم کی آیات سنیں تو اپنا قریش کے ایک گروہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا:

واللہ لقد سمعت من محمد کلاما ما ھو من کلام الانس ولا من کلام الجن وان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ وان اعلاہ لمثمر وان اسفلہ لمغدق۔ [۱۶]

ترجمہ: بخدا میں نے محمدؐ سے ایک ایسا کلام سنا ہے جو نہ ہی انسانوں کا کلام ہے اور نہ ہی جنوں کا۔ یقیناً اس میں حلاوت و شیرینی ہے۔

پھر اس حقیقت سے کیوں کر انکار کیا جا سکتا ہے کہ کفار و مشرکین ایک دوسرے کو آپس میں باز رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے اور اپنے بچوں کو تنبیہ کیا کرتے کہ اس کلام کے پاس ہرگز نہ پھٹکیں۔ کفار و مشرکین کی زبانی قرآن پاک جو الفاظ نقل کرتا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں:

لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون۔ [۱۷]

ترجمہ: تم لوگ اس قرآن پر کان نہ دھرو، اور اس کی تلاوت کے دوران خوب شور کرو تاکہ تم غالب آ جاؤ۔

پھر عربوں کا اخیر وقت تک قرآن کے سلسلے میں کسی ایک قول پر نہ ٹکے رہنا اور مقابلہ صرف "لو نشاء لقلنا مثل ھذا" کے الفاظ کہہ کر دل کی بھڑاس نکالنا بھی قرآن کی سحر انگیزی پر ایک شہادت ہے۔

قرآن کا عربی مبین میں ہونا دشمنان دین کا قرآنی چیلنج کے سامنے عجز و درماندگی کا ثبوت دینا اور ان کی قوت فیصلہ کا شل ہو جانا یہ تمام امور بذات خود قرآن کے اثر انگیز کلام ہونے پر دال ہیں پھر قرآن نے اپنے بے پناہ اثر سے عالم عربی پر احسان کر کے جو نتائج پیدا کئے وہ دوسری تمام زبانوں کے مثبت نتائج سے مافوق ہیں۔

قرآن مجید کا پہلا اثر یہ ہوا کہ قبائل عرب کی لسانی بولیوں کو قریش کے لہجہ پر جمع کر دیا۔ اگرچہ قریش کا لہجہ جاہلیت میں تمام قبائل پر غالب تھا، تاہم پورے طور پر اسے دوسرے

نجوم پر غلبہ نزول قرآن کے بعد ہوا۔

دوسرا اثر عربی زبان وادب پر یہ ہوا کہ یہ دین سماوی کی حامل زبان بن گئی۔ ایسے ایسے الفاظ وجود میں آئے جو نزول قرآن سے پہلے معروف نہیں تھے جیسے الفرقان، الکفر، الایمان، الشرک، الاسلام، النفاق، الصوم، الصلوٰۃ، الزکوٰۃ، التسبیح، الرکوع اور السجود وغیرہ۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کی بدولت زبان وادب کا خزینۂ الفاظ بڑھا اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پہلی ایک نئے ضابطۂ حیات کا علمی قیام بھی اسی کتاب ہدایت کی بدولت ہوا۔ شوقی ضیف کے بقول عربوں نے جن علوم و معارف سے بھی شناسائی حاصل کی وہ محض اس قرآن کریم کا فیض ہے جس نے ان کی زندگیوں کو علوم و معارف سے آشنا کیا اور اسی قرآن کے سبب انھوں نے براہ راست علوم کے دوسرے خزینوں پر کمندیں ڈالیں جیسے علم اسباب، علم قرأت، علم تفسیر، علم اسباب نزول، علم نحو، علم اعراب، علم فقہ اور اصول فقہ کے علاوہ ایسے خاص و عام علوم جن کے ذریعہ علوم بلاغت کو ترقی ملی۔ [18]

تیسرا اثر یہ ہوا کہ زبان عربی نجد و حجاز کے دیہاتوں سے نکل کر کوفہ، دمشق، بغداد، بصرہ، قرطبہ اور مصر میں داخل ہوگئی اور اسی زبان سے کالے گورے، چھوٹے بڑے سبھی مستفیض ہونے لگے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین اپنے ایک لکچر میں کہتے ہیں کہ عربی زبان کے اندر ایسی خصوصیت ہے جو یونانی زبان میں نہیں پائی جاتی اور وہ ہے اس کی قوت و جاذبیت اور دوسری مقامی زبانوں پر غلبہ کی قدرت۔ پھر آگے تحریر کرتے ہیں کہ نزول قرآن کی تین ہی صدیوں کے درمیان ایرانی اپنے ایرانی ادب سے اعراض کرکے ادب عربی کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ بشار اور ابو تمام جیسے عربی کے بڑے شعراء بھی اصلاً ایرانی نسل سے ہی منظر عام پر آئے۔ [19]

نزول قرآن کے بعد عربی زبان پر ایک انتہائی قابل ذکر اثر یہ بھی پڑا کہ قرآن نے زبان و ادب کو تہذیب و تزئین کا زیور پہنایا اور اسے مضبوط و محکم اسلوب کا جامہ بھی دیا۔

قرآن پاک کے فکری اور ادبی معلمانہ حیثیت اور سحر انگیز فصاحت و بلاغت کے مطالعے کے بعد یہ بات آشکارا وصاحت پاتی ہے کہ زبان و ادب پر اس کتاب الٰہی کا

بڑا احسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت و اسلام کے شہسواران ادب نے بھی اسی قرآن پاک کو اپنی خاص توجہات کا مرکز بنایا۔ زغلول سلام اپنی تصنیف میں ادبی حیثیت سے قرآنی عظمت کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

للقرآن فضل كبير في تطور دراسات اللغة والنقد اللغوي۔ ولم يكن حرص العرب على اللغة الاصيلة، لغة البدو وتشددهم في المحافظة عليها الا رغبة منهم في حفظ نصة القرآن ليظل مفهوما مقروءا متدارسا۔ [19]

ترجمہ: لغت اور لغوی تنقید کے مطالعوں کو فروغ دینے میں قرآن پاک کا ایک نمایاں مقام ہے اور (یہ سچ ہے کہ) اہل عرب اپنی اصل زبان یعنی بدوی زبان اور اسے آپس میں حفظ کرنے کی تلقین کے سلسلے میں حریص و متشدد نہیں ہوئے، ہاں قرآن پاک ہی ایک ایسی کتاب تھی جس کی زبان کو یاد کرنے کی طرف راغب ہوگئے تاکہ اسے سمجھا، پڑھا اور باہم سکھایا جا سکے۔

اور پھر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ قرآن نے عربی زبان میں نازل ہو کر خود عربی زبان و ادب کو بھی زندۂ جاوید کر دیا۔ دنیا کی کوئی زبان بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نزول قرآن سے لے کر آج تک عربی زبان اپنی سحر انگیزی کے سبب قرآن پاک کی محتاج ہے۔ دور جاہلیت کے وہ شعراء جو زلف گرہ گیر، خمِ ابرو اور صحرائی حسن و عشق کے چرچوں کے لئے مشہور تھے جن کے شعری تخیلات لگ بھگ معلقہ کی صورت میں دیوار کعبہ سے آویزاں رہتے تھے قرآنی تعلیمات کے زیر اثر ان کے انداز فکر میں تبدیلی آگئی۔ [20]

یہ سچ ہے کہ ہمہ گیر فکر و نظر کی تبلیغ کرتے ہوئے عربی ادب کو کئی جہتوں سے مالامال کرتے ہوئے قرآن پاک نے زبان و ادب کی تہذیب و تزئین کا ہی بیڑا نہیں اٹھایا بلکہ علوم و فنون کا دائرہ بھی وسیع کر دیا کیونکہ اسی قرآن کی بدولت لغت، نحو، صرف، اشتقاق، معانی، بدیع، بیان، ادب، علم قرأت، تفسیر، اصول اور فقہ جیسے علوم منظر عام پر آئے۔ اس لحاظ سے جہاں صحیح فکر و نظر کے فروغ و اشاعت کا سہرا قرآن پاک کے سر بندھتا ہے

دنیا اس کتاب مقدس کو مختلف علوم و فنون کی انسائیکلوپیڈیا ہونے کا شرف و اعزاز بھی حاصل ہے۔ ••

مصادر و مراجع

۱۰ سورہ البقرہ آیت ۱۲۹
۱۱ سورۂ شعراء آیت ۷۸ تا ۸۱
۱۲ سورۂ زمر آیت ۶۸
۱۳ ایضاً آیت ۶۹
۱۴ ایضاً آیت ۷۱
۱۵ تاریخ الادب العربی، عصر الجاہلی ص ۳۰ شوقی ضیف ۱۹۶۰ء دار المعارف، مصر
۱۶ " " " "
۱۷ سورہ حٰم السجدہ آیت ۲۶
۱۸ تاریخ الادب العربی عصر الجاہلی شوقی ضیف ص ۲۱۔ ۱۹۶۰ء دار المعارف۔ مصر
۱۹ اثر القرآن فی تطور النقد العربی۔ محمد زغلول سلام ص ۱۳۹ دار المعارف۔ مصر
۲۰ قرآن اور ادیب۔ ناہد ملک ۱۹۸۰ء راولپنڈی

ادارہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کو
ایک اور سانحہ

ادارہ حیات نو نے یہ خبر بڑے درد کے ساتھ سنی کہ مولانا ابو العرفان ندویؒ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ موصوف ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۶ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم رہے۔ انجم اور بعد علم کلام اور فلسفہ آپ کی اہم تصنیفات ہیں۔ مولانا عبدالحی حسنیؒ کی الثقافۃ الاسلامیہ کا ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" آپ ہی کے قلم سے شائع ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں طالب علم کی حیثیت سے ندوہ میں داخل ہوئے اور زندگی کے آخری لمحہ تک اس سے تعلق برقرار رکھا مولانا ایک علم دوست آدمی تھے۔ فلسفہ اور تاریخ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ حافظہ غضب کا پایا تھا۔ مدارس کے نظام تعلیم و تربیت اور ان کے مسائل سے گہری دلچسپی تھی۔ جامعۃ الفلاح کے تعلیمی نظام، نہج تدریس اور انداز تربیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ انجمن نے "دینی مدارس اور ان کے مسائل" پر ایک سیمینار کرنے کا ارادہ کیا تو مولانا نے اس کو پسند فرمایا۔ آپ جامعہ تشریف لائے جب نہ کوئی مہمان خانہ تھا اور نہ مہمانوں کے استقبال اور ان کی ضیافت کا کوئی معقول نظم۔ راستہ میں آپ کو زحمتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ سیمینار کا معقول اور بروقت انتظام نہیں ہو سکا۔ آپ جامعہ آئے اور مدارس اور جدید طریقہ تدریس پر اپنا قیمتی مقالہ پیش فرمایا جسے پسند کیا گیا اور وہ عنقریب دوسرے مقالات کے ساتھ کتابی شکل میں آنے والا ہے۔

۱۷ نومبر ۱۹۸۹ء کو سوا سات بجے صبح میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ۶۵ سال کی عمر میں جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اس موقع پر جہاں سکریٹری انجمن مجاہد اشرف فلاحی نے اپنے گہرے دکھ کا اظہار فرمایا وہیں صدر جامعہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے درج ذیل بیان دیا:

"۱۹ نومبر ۱۹۸۹ء کو "قومی آواز" میں، حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے مولانا

ابو العرفان ندوی کے انتقال کی خبر دیکھ کر سخت رنج و افسوس ہوا۔ مولانا نہ صرف ایک اچھے عالمِ دین تھے بلکہ عصری علوم پر بھی خاص نظر رکھتے تھے۔ وہ ایک متواضع، منکسر المزاج، وسیع القلب اور دردمند انسان تھے۔ ایک طویل عرصہ تک دار العلوم ندوۃ العلماء میں مہتمم کے عہدے پر سرفراز رہے اور اس کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ گزشتہ سال ہمارے عزیز ابنائے قدیم کی دعوت پر جامعہ بھی تشریف لائے تھے اور ایک گرانقدر مقالہ بھی پیش فرمایا تھا۔ مولانا کو جامعہ سے ایک خاص لگاؤ تھا اور وقتاً فوقتاً وہ اپنے قیمتی مشوروں سے جامعہ کو نوازتے رہتے تھے۔

ہم مولانا کے اہلِ خانہ، دار العلوم ندوۃ العلماء اور ندوی برادری کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

نعت

عزیز بگھروی

حق سراپا خیر، باطل شر تمام
ایک رحمت ایک غارت گر تمام

اک طرف تنہا حبیبِ کبریا
ایک جانب وقت کے تیور تمام

تیغ دستِ قدس میں کوئی نہ تھی
جھک گئے کیوں کر کشیدہ سر تمام

رحمتِ عالم کے دروازے کھلے
بند اربابِ ہوس کے در تمام

انجمن میں سرورِ کونین کی
تھے برابر اسود و احمر تمام

خلوتِ وحدت ہے کس کی منتظر
دم بخود انسان و ملک ششدر تمام

قائدِ برحق محمد مصطفےٰ
واجب التعظیم پیغمبر تمام

اللہ اللہ جاں نثارانِ نبی
نرم باہم سخت دشمن پر تمام

زندگی ہٹ کر شریعت سے عزیز
اک مسلسل کرب، شور و شر تمام

حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ

تحریر: ڈاکٹر عبد الرحمٰن رافت پاشا۔ ترجمانی: ابو جاوید

ہجرتِ نبوی کے نویں سال شاہانِ عرب میں سے ایک شخص اپنی شدید نفرت و بیزاری، پیہم تکبر، اعراض اور مسلسل جحود و انکار کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہوا۔ وہ بادشاہ تھا عدی بن حاتم طائی جس کے باپ کی سخاوت و فیاضی آج تک ضرب المثل ہے۔

ریاست و حکومت عدی کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ چنانچہ اس کے قبیلے قبیلۂ بنی طے نے اس کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ اس کے لیے مقرر کیا اور قبیلے کی قیادت و سربراہی کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی۔

جب رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے علی الاعلان اسلام کی دعوت کا آغاز کیا اور عرب کے بہت سے قبائل ایک ایک کر کے ان کے حلقۂ اطاعت میں آتے چلے گئے تو عدی نے محسوس کیا کہ اس دعوت کے پس پردہ ایک ایسی قیادت ابھر رہی ہے جو اس کی قیادت کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے اور اس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس پیغام کے زیرِ سایہ ایک ایسی ریاست نشوونما پا رہی ہے جو اس کی ریاست کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے گی۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت اور ان کے ساتھ سخت بغض و عداوت پر کمربستہ ہو گیا حالانکہ نہ تو وہ اس سے پہلے براہِ راست رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے واقف تھا نہ آپؐ کے دیدار سے مشرف ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے تقریباً بیس قیمتی سال اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی نذر کر دیئے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے کو قبولیتِ حق کے لیے کھول دیا۔

حضرت عدیؓ بن حاتم کے مسلمان ہونے کی کہانی ایک دلچسپ اور ناقابلِ فراموش کہانی ہے۔ ہم یہ بات انھیں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس کہانی کو اپنی زبان سے بیان کریں

کیونکہ وہی اس کے لئے زیادہ مناسب ہیں اور انہی کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ حضرت عدی اس کہانی کا آغاز کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

"جس وقت میں نے محمدؐ کی نبوت اور ان کی دعوتی سرگرمیوں کا حال سنا اس وقت عرب کے کسی شخص کو مجھ سے زیادہ ان کے ساتھ نفرت نہ تھی۔ میں اپنے قبیلے سے مالِ غنیمت کا چوتھائی وصول کیا کرتا تھا، جس طرح میرے علاوہ دوسرے سردار اپنے قبائل سے وصول کیا کرتے تھے۔ جب میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر سنا تو مجھے سخت ناگوار گزرا اور جب ان کی قوت و شوکت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا اور ان کے لشکر اور فوجی دستے عرب کے مشرق سے لے کر مغرب تک دندنانے لگے تو میں نے اپنے غلام کو، جو میرے اونٹ چرایا کرتا تھا، ہدایت کی:

"میرے سفر کے لئے چند تندرست، توانا اور سیدھی سادی اونٹنیاں ہر وقت تیار رکھو اور انہیں میرے قریب باندھ دو اور جب سنو کہ محمدؐ کا لشکر یا ان کا کوئی فوجی دستہ اس علاقے میں داخل ہو گیا ہے تو مجھے اس کی خبر دو۔"

ایک دن صبح کے وقت غلام نے مجھ سے کہا:

"آقا! آپ اپنے علاقے میں محمدؐ کے سواروں کی آمد پر جو کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اب سے کر گزریئے!"

میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا:

"میں نے کچھ جھنڈے اس علاقے میں حرکت کرتے ہوئے دیکھے ہیں۔ ان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ محمدؐ کا لشکر ہے۔"

میں نے اس سے کہا:

"جن اونٹنیوں کو تیار رکھنے کا میں نے تم کو حکم دیا تھا انہیں فوراً میرے پاس لے آؤ۔"

پھر میں اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے اہل و عیال کو اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر کوچ کرنے کا حکم دے دیا اور تیز رفتاری کے ساتھ سرزمینِ شام کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ اپنے ہم مذہب نصاریٰ کے پاس پہنچ کر وہاں قیام کروں۔ میں عجلت میں اپنے گھر کے

تمام افراد کو جمع نہ کر سکا۔ جب خطرے کے حدود سے نکل کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میں اپنی بہن کو قبیلۂ طے کے باقی ماندہ افراد کے ساتھ اپنے وطن نجد ہی میں چھوڑ آیا ہوں۔ اب میرے لئے اس کے پاس پلٹ کر جانے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مجبوراً اسے چھوڑ کر اپنے ساتھ آئے ہوئے اہل خاندان کو لئے شام چلا گیا اور وہاں اپنے ہم مذہب لوگوں میں قیام پذیر ہو گیا اور میرے پیچھے میری بہن میری توقع کے مطابق ان حالات سے دوچار ہوئی جن کا پہلے ہی سے مجھے اندیشہ تھا۔

شام میں مجھ کو اطلاع ملی کہ محمدؐ کے سواروں نے ہمارے علاقے پر حملہ کیا۔ میری بہن کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ یثرب لے جایا گیا اور مسجد کے دروازے کے قریب ایک احاطے میں بند کر دیا گیا۔ مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ ایک دن نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر میری بہن کی طرف سے ہوا تو اس نے اٹھ کر ان سے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول! میرے والد فوت ہو چکے ہیں، میرا سرپرست غائب ہے، آپ مجھ پر احسان کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ پر احسان کرے گا۔"

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا:

"کون ہے تمہارا سرپرست؟"

وہ بولی "عدی بن حاتم"

"کون عدی بن حاتم؟ اللہ اور اسکے رسول سے بھاگنے والا؟"

اتنا کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ دوسرے روز بھی جب آپ کا گزر اس کی طرف سے ہوا تو اس نے دوبارہ وہی باتیں کہیں جو کل کہہ چکی تھی اور آپ نے بھی وہی جواب دیا جو کل دے چکے تھے اور جب تیسرے دن آپ ادھر سے گزرے تو چونکہ وہ مایوس ہو چکی تھی، اس لئے خاموش رہی، آپ سے کچھ نہیں کہا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے ایک شخص نے اسے اشارہ کیا کہ اٹھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بات کرو۔ چنانچہ اس نے کہا:

"اے اللہ کے رسول! میرا باپ فوت ہو چکا ہے اور میرا سرپرست غائب ہے، آپ

میرے اوپر احسان فرمایئے، اللہ تعالیٰ آپ پر احسان فرمائے گا۔" اور آپ نے اس پر احسان فرماتے ہوئے اس کی رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔ رہائی پا کر اس نے کہا کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس شام جانا چاہتی ہوں۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ جب تک تمہارے قبیلہ کا کوئی قابلِ اعتماد آدمی نہیں مل جاتا روانگی میں جلدی نہ کرنا اور جب کوئی قابلِ اعتماد شخص مل جائے تو مجھے بتانا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد اس نے اس آدمی کے متعلق دریافت کیا جس نے اسے بات کرنے کا اشارہ کیا تھا، تو معلوم ہوا کہ وہ علیؓ بن ابی طالب تھے۔

وہ مدینہ میں ٹھہری رہی۔ اسی دوران کچھ لوگوں کا وفد وہاں آیا جس میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے اوپر وہ اعتماد کر سکتی تھی۔ اس نے بارگاہِ نبوی میں عرض کیا کہ میرے قبیلے کے کچھ لوگ یہاں آئے ہیں، مجھے ان کے اوپر مکمل اعتماد ہے، وہ مجھے میری منزل تک پہنچا دیں گے۔ تو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے پہننے کے کپڑے، سواری کی اونٹنی اور بقدرِ ضرورت زادِ راہ دے کر رخصت کیا اور وہ ان کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

عدیؓ نے سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:

ادھر شام میں ہم کو برابر اس کے حالات کی اطلاع ملتی رہتی تھی اور ہم اس کے شام پہنچنے کے منتظر تھے۔ حالانکہ ہم نے محمدؐ کے مقابلے میں جو رویہ اپنایا تھا اس کے پیشِ نظر ہمارے دل ان اطلاعات کی تصدیق کرنے پر آمادہ نہیں تھے جو میری بہن کے ساتھ محمدؐ کے اس احسانِ عظیم کے سلسلے میں ہم تک پہنچ رہی تھیں

انھیں حالات میں ایک روز میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک عورت پر پڑی جو اپنے ہودج میں بیٹھی ہماری طرف چلی آرہی تھی۔ میرے دل نے کہا "یہ حاتم کی بیٹی ہے۔ یہ میری بہن ہے۔" جب وہ کچھ اور قریب آئی تو ہم نے اسے صاف طور پر پہچان لیا۔ واقعی وہ میری بہن ہی تھی۔ وہ ہمارے پاس پہنچ کر سواری سے اترتے ہی خفگی کے لہجے میں بولی:

"بے مروّت ...... ظالم ..... تو نے اپنی بیوی اور بچوں کو تو اپنے ساتھ لے لیا

اور اپنے باپ کی اولاد اور اپنی عزت کو پیچھے چھوڑ کر چلا آیا۔"

میں نے کہا "پیاری بہن! صرف اچھی باتیں کہو" اور میں اسے راضی کرنے لگا۔ آخر کار وہ مجھ سے راضی ہو گئی اور پھر اس نے اپنے سارے حالات تفصیل سے بیان کئے جو بالکل وہی تھے جو ہم کو پہلے پہنچتے رہے تھے۔ پھر میں نے اس سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا ــــ وہ نہایت دور اندیش، عقلمند اور سمجھدار عورت تھی ــــ "اس شخص (محمدؐ) کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" اس نے کہا کہ "میری رائے یہ ہے کہ تم جلد از جلد ان کی خدمت میں پہنچ جاؤ۔ اگر واقعی وہ نبی ہیں تو تمہارے جیسے آدمی کا ان کی تصدیق و تائید میں پیچھے رہ جانا بڑی افسوسناک بات ہو گی اور اگر وہ بادشاہ ہیں تو ان کے یہاں تمہاری ناقدری نہیں ہو گی۔"

عدیؓ بن حاتم کہتے ہیں کہ پھر میں نے سفر کی تیاری کی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ پہنچا۔ میں نے اس سے پہلے نہ تو ان کے پاس اپنے پہنچنے کی اطلاع بھیجی تھی نہ ان سے اپنے لئے امان حاصل کی تھی البتہ مجھے اس بات کی اطلاع ہو گئی تھی کہ انھوں نے میرے متعلق اپنے اصحاب سے فرمایا ہے کہ "مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ عدی ابن حاتم کا ہاتھ میرے ہاتھ دے دے گا۔"

جب میں مدینہ پہنچا تو اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے۔ میں نے حاضرِ خدمت ہو کر آپ کو سلام کیا تو پوچھا:

"کون ہو؟"

"عدی۔ حاتم طائی کا بیٹا" میں نے جواب دیا۔

یہ سن کر آپؐ اپنی جگہ سے اٹھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کی طرف لے چلے۔ آپ مجھے ساتھ لئے چلے جا رہے تھے کہ راستے میں انھیں ایک نہایت بوڑھی عورت ملی جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچّہ تھا۔ وہ ان کو روک کر اپنی کسی ضرورت کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ آپ ٹھہر کر پوری توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سنتے رہے۔ دورانِ گفتگو میں وہیں کھڑا رہا۔ کھڑا کھڑا میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ "خدا یہ بادشاہ نہیں ہو سکتے۔"

عبادت سے فارغ ہو کر آپؐ نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا اور چلتے ہوئے اپنے گھر پہنچ گئے۔ گھر میں پہنچ کر آپؐ نے چمڑے کا ایک تکیہ اٹھایا جس میں کھجور کے ریشے بھرے ہوئے تھے۔ آپؐ نے اس کو میری طرف ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اس پر بیٹھ جاؤ۔ مگر آپؐ کے سامنے اس پر بیٹھتے ہوئے مجھے شرم آئی اور میں نے اسے بے ادبی پر محمول کرتے ہوئے عرض کیا! نہیں! اس پر آپ تشریف رکھیں لیکن آپ نے اصرار کر کے مجھے اس پر بٹھایا اور خود زمین ہی پر بیٹھ گئے کیونکہ گھر میں اس کے علاوہ دوسرا تکیہ نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے دل میں کہا "بخدا یہ انداز کسی بادشاہ کا ہرگز نہیں ہو سکتا" اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد آپ نے مجھے مخاطب کیا

"عدی! بتاؤ کیا تم رکوسی نہ تھے؟ تم ایک ایسے دین کو اختیار کئے ہوئے نہ تھے جو نصرانیت اور صابیت کے درمیان تھا؟"

"بے شک۔ میں رکوسی تھا اے اللہ کے رسولؐ!" میں نے جواب دیا۔

"کیا تم اپنی قوم سے مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ نہیں وصول کرتے تھے کیا تم ان سے وہ مال نہیں لیتے تھے جو تمہارے دین میں حلال نہ تھا؟" آپؐ نے دوبارہ فرمایا۔

"ہاں، اے اللہ کے رسولؐ! میں ایسا کرتا تھا اور اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ یہ نبی مرسل ہیں۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا،

"عدی! شاید تم اس دین کو قبول کرنے سے اس لئے ہچکچا رہے ہو کہ آج مسلمان مفلس اور تنگ دست ہیں لیکن خدا کی قسم وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب ان کے یہاں مال و دولت کی اتنی فراوانی ہو جائے گی کہ کوئی اسے لینے والا نہیں ملے گا۔ یا شاید تم اس دین میں داخل ہونا محض اس لئے ناپسند کرتے ہو کہ آج مسلمانوں کی تعداد کم اور ان کے دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن خدا کی قسم عنقریب تم سنو گے کہ ایک عورت تن تنہا اپنے اونٹ پر سوار ہو کر حج بیت اللہ کے لئے قادسیہ سے نکلتی ہے اور دورانِ سفر اسے خدا کے سوا کسی کا خوف نہیں محسوس ہوتا۔ یا شاید اس دین کو قبول کرنا تم کو اس لئے گوارا نہیں ہے کہ تم دیکھ رہے ہو کہ آج زمامِ حکومت دوسروں کے ہاتھوں میں ہے

اور مسلمان اس سے محروم ہیں لیکن خدا کی قسم تم جلد ہی سن لو گے کہ بابل کے سفید محلات مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گئے اور کسریٰ کے خزانے ان کے قبضے میں آ گئے۔"

"کیا؟ کسریٰ ابن ہرمز کے خزانے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں۔ کسریٰ بن ہرمز کے خزانے!" آپؐ نے پورے وثوق کے ساتھ فرمایا۔

"اور اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھ کر میں دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔"

حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے طویل عمر پائی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دو پیش گوئیاں تو حرف بہ حرف پوری ہو چکی ہیں صرف ایک باقی رہ گئی ہے اور خدا کی قسم وہ بھی یقیناً پوری ہو کر رہے گی۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ قادسیہ سے اونٹ پر سوار ہو کر نکلی اور بلا خوف و خطر مکہ پہنچ گئی۔ اور میں اس فوج کے اگلے دستے میں تھا جس نے کسریٰ کے خزانوں پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کیا تھا میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تیسری پیش گوئی بھی ضرور پوری ہو گی۔"

اللہ کی مشیت کے مطابق نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بات پوری ہوئی اور تیسری پیش گوئی بھی خلیفۂ زاہد و عابد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ خلافت میں پوری ہو گئی۔ اس وقت مسلمان مالی اعتبار سے اس قدر خوش حال ہو گئے تھے کہ خلیفہ کا منادی فقراء و مساکین کو زکوٰۃ کا مال لینے کے لئے پکارتا مگر کوئی اس کو لینے والا نہ تھا۔ اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بات صحیح اور حضرت عدی ابن حاتمؓ کی قسم پوری ہوئی۔ ●●

حلقۂ یاراں

برادرم حضرت مولانا ولی اللہ صاحب فلاحی، زید مجدکم! سلام عقیدت قبول فرمائیں۔

عرض ہے کہ اس سے قبل ستمبر کا شمارہ ملا، اور کل ہی اکتوبر کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ الحمد للہ دوائی امراض کی دو قسطیں ماہنامہ حیات نو میں آگئیں۔ بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ محترم کو اجر جزیل سے نوازے اور ماہنامہ کو عروج کے ساتھ ترقی یا قبول عطا فرمائے۔ آمین۔

اساتذہ وطلبہ بھی ذوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ہر شمارہ پورے ماہ یا زیر گشت کرتا رہتا ہے۔ دوسرے حضرات بھی اپنے نام ذاتی طور پر جاری کرانے کی بات سوچ رہے ہیں اور میں بھی اس فکر میں ہوں کہ کچھ اور لوگوں کو خریدار بناؤں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے آمین۔

۱۵؍ اکتوبر ۹۹ء عبدالحمید اصلاحی

صدر انجمن اصلاح البیان۔ پٹنہ ۔ ۶ ۔ بہار

محترمی! سلام مسنون

ماہنامہ حیات نو کا شمارہ نومبر ۹۸ء نظر نواز ہوا جس میں میری غزل شائع ہوئی ہے۔ سال بھر پرانے پرچے کو آپ نے تلاش کر کے ارسال فرمایا۔ اس زحمت کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔

پرچہ از اول تا آخر بلند پایہ مقالات پر مشتمل ہے۔ آپ کی کاوشوں کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کتابت وطباعت، کاغذ وظاہری آرائش وزیبائش کے لحاظ سے بھی دلکش اور پسندیدہ ہے۔ خدا کرے یہ اب بھی اسی طرح شائع ہو رہا ہو۔

ایک نظم حاضر خدمت ہے قریبی اشاعت میں ممکن ہو تو شامل فرما دیں۔ تازہ شمارہ سے پرچہ جاری فرما دیں۔ سبھی رفقاء اور خصوصاً محترم ابو بکر صاحب کی خدمت میں میری جانب سے سلام مسنون پہنچا دیں۔

والسلام

محمد قمرالدین قمر۔ رام نگر وارانسی ۱۱؍ اکتوبر ۹۹ء

محترم ومکرم جناب ولی اللہ سعیدی فلاحی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ کا شکر ہے کہ آپ کا ماہنامہ پرچہ حیات نو اکتوبر کا میری نظروں سے گزرا۔ ماشاء اللہ پرچہ مجھے کافی پسند آیا خاص کر اداریہ اور وفیات کا طرز اسلوب۔ میں کیا تعریف بیان کروں۔ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے ہیں ورنہ میں بہت کچھ لکھتا۔ بہر حال میں بلا کسی مبالغہ کے اتنا ضرور کہوں گا کہ پرچہ اب پہلے کی بہ نسبت بہت اچھا ہو گیا ہے۔ اسی طرح اگر آپ اپنی کوشش کو قائم ودائم وجاری وساری رکھیں گے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ پرچہ کچھ دنوں بعد اپنی ترقی کی انتہا کو پہنچ جائے۔ آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ اسے بہتر سے بہتر بنائے تاکہ اس مجلّے سے دین کی خدمت ہو سکے اور خریداران میں اضافہ بھی۔

والسلام

آفتاب رحمانی

مکرمی ایڈیٹر حیات نو! سلام مسنون

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

اکتوبر کے علاوہ نومبر و دسمبر ۱۹۹۸ء کا مشترکہ شمارہ نظر سے گزرا۔ تنقید وتجزیہ کے کالم میں آپ کی تحریر بعنوان "ساری دنیا جو خفا ہے تو خفا ہونے دو" پڑھی۔ بڑی دلچسپ تحریر ہے اور وقت کے ناسور پہ بہترین نشتر۔ خدا آپ کی تحریر میں خلوص پیدا کرے۔

یہ باتیں میرے ذہن کی وادیوں میں بھی ایک عرصہ سے چکر لگا رہی تھیں مگر اچھا ہوا کہ یہ باتیں آپ کی جنبش قلم ہوئیں۔ یہ حسن اتفاق ہی تو ہے کہ میں نے اس مضمون کو اداریے سے پہلے پڑھا لیکن مضمون پڑھنے کے بعد چند باتیں کہے بنا نہیں رہوں گا اور اس کے لئے معذرت خواہ ہوں اور تہ دل سے معذرت خواہ ہوں۔

مضمون بہت عجلت اور جلد بازی میں تحریر کیا گیا ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو اس کی اہمیت وافادیت مزید بڑھ جاتی ہے اور خامیوں سے پاک دلچسپ اور جاندار ہوتا۔

مضمون میں ایک جگہ پاکستان کے بجائے ویسٹ انڈیز تحریر ہو گیا ہے جس کی وجہ سے بات

بالکل بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہو گئی ہے۔ ترجمہ کی اکثر غلطیاں، جتنی ہیں جو آپ کے اپنے کام کرنے کی گواہی دیتی ہیں۔

اس کے علاوہ پاکستانی کرکٹ ٹیم کے حالیہ دورہ کی اگر روداد ہوتی تو آپ کو اپنی بات قارئین تک پہنچانے میں مدد ملتی مثلاً یہ کہ دنیائے کرکٹ کے عظیم اور مشہور کرکٹر پاکستانی ٹیم کے کپتان عمران خان کی جمشید پور میں کیا درگت بنی اور ان پر کیلوں اور ... کی بارش کی گئی۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ٹیموں کے کھلاڑیوں سے جو برتاؤ کیا جاتا ہے وہ ڈھکا چھپا نہیں ہے یہ سب باتیں خود ہی سربراہان مملکت کے اس بیان کو رد کراتی ہیں:

The sports create good will between the nation.

کچھ دن پہلے اصل تجوید تبصرہ کے لئے بھجوایا تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا۔ اس کی طرف توجہ دیں گے۔ امید ہے مزاج عالی بخیر ہوگا۔

والسلام

نیازمند: محمد الیاس اعظمی۔ ۳، دسمبر ۱۹۸۸ء

بقیہ: یہ جہاد نہیں خودکشی ہے

لیکن اگر خدانخواستہ ہم اپنی روش بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور تشدد اور اشتعال انگیزی کی پالیسی پر ہی اصرار کرتے ہیں تو کم از کم یہ تو ہمیں اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے کہ اس طرح ہم خدا کی راہ میں کوئی جہاد کر رہے ہیں۔

یہ جہاد نہیں، خودکشی ہے۔ اور خودکشی کا انجام کیا ہوتا ہے اور کیا ہوگا، یہ ہم سب کو معلوم ہے۔

وما علینا الا البلاغ

عبدالرحمٰن عربی شعبہ

اخبار علمیہ

آکسفورڈ یونیورسٹی کیلئے عالمی پیمانے پر چندہ

دیوبند، ندوہ اور دوسرے مدارس دینیہ کو چاہیے اس پر متعلق حیرت نہ ہو مگر اور دہ پرست دنیا نے اس خبر پر تعجب کا اظہار کیا کہ انگریزی زبان کی قدیم ترین یونیورسٹی آکسفورڈ کے ارباب انتظام یونیورسٹی کی سقیم مالی حالت کے پیش نظر عالمی پیمانے پر چندہ کی مہم شروع کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد سردست ۳۸۰ ملین ڈالر (۷۵ کروڑ روپئے) جمع کرنا ہے۔ مہم کے محرک ہنری ڈرکر نے بتایا کہ سنہ ۱۹۳۰ء تک آکسفورڈ کے مصارف انفرادی عطیات سے پورے کئے جاتے تھے پھر حکومت نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ مگر اب اس سال امداد میں کمی کر دی جس سے معلموں، ملازموں اور نئے تحقیقی منصوبوں کی تکمیل میں شدید دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں اس وقت سو لکچرر اور چھ پروفیسروں کی جگہیں خالی ہیں۔ نئے منصوبوں میں مشہور عالم اور برطانیہ میں انڈیا آفس لائبریری کے بعد دوسرے سب سے بڑے کتب خانہ بوڈلین لائبریری کی تنظیم نو بھی شامل ہے۔ اس کے ہندوستانی حصہ میں اسی ہزار کتابیں اور مخطوطات ہیں جو محققین کے لئے اہم مصادر و مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بشکریہ ماہنامہ "معارف" دسمبر صفحہ ۴۵۵

چین کو قرآن کے ایک ہزار نسخوں کا تحفہ

حال ہی میں رابطہ عالم اسلامی نے چین کو قرآن کے ایک ہزار نسخے پیش کئے ہیں جن کا ترجمہ چینی زبان ہی میں ہوا ہے۔ یہ نسخے اسلامی تنظیموں اور جماعتوں میں تقسیم کئے جائیں گے اس کا واحد مقصد غیر عربی داں طبقہ کو قرآنی تعلیمات سے روشناس کرانا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس کار خیر کو قبول فرما کر جزائے خیر عطا فرمائے۔

بشکریہ اخبار العالم الاسلامی، مکہ مکرمہ۔ ۵، دسمبر صفحہ ۱۶

آئی۔ڈی۔بی کا تعاون

اسلامک ڈیولپمنٹ بینک آف جدہ نے کینیا کو ایک ملین ڈالر دیا ہے۔ کینیا میں دو ثانوی اداروں کا قیام پیش نظر ہے۔ یہ رقم اسی مد میں صرف ہوگی۔ یہ ادارے مسلمانان کینیا کے لئے ان کے سپریم کونسل کی مدد سے قائم ہوں گے۔

ایک ادارہ کینیا کے دارالحکومت نیروبی میں قائم ہوگا جس میں کل تقریباً پانچ لاکھ ڈالر کی لاگت آئے گی۔ دوسرا ادارہ ساحلی شہر [illegible] میں قائم ہوگا جو دارالحکومت سے ستر کلومیٹر دور ہے۔ ہر ادارہ میں کل ۳۲۰ طلبہ وطالبات داخل ہو سکیں گے۔ اس سال جلد ہی ادارے کی تعلیمی سرگرمیاں شروع ہو جائیں گی۔

یہ اسلامک ڈیولپمنٹ بینک کی نیک کوشش ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تعلیمی معیار کو بلند کیا جائے۔ عربی زبان کو عام کیا جائے اور اسلامی علوم کو جگہ جگہ پھیلایا جائے۔

بشکریہ "اخبار العالم الاسلامی"۔

شیخ شعراوی کو قرآن کے بیس ہزار نسخے دیئے گئے

رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹریٹ آفس کی طرف سے مشہور داعیٔ اسلام محمد متولی شعراوی کو قرآن کریم کے بیس ہزار نسخے دیئے گئے ہیں۔ موصوف اس کے کچھ نسخے مصری مسلمانوں کو دیں گے اور کچھ مسجدوں، دینی اداروں، طالب علموں اور حفاظ کرام کے درمیان تقسیم کریں گے۔

یہ بہت بڑا کار ثواب ہے۔ خدائے تعالیٰ قبول فرمائے۔

بشکریہ "الندوۃ" ۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۵

ملیشیا میں ایک بڑی مسجد کا افتتاح

گذشتہ دنوں مشرقی ایشیا کے جنوب میں ایک بڑی مسجد کا باقاعدہ افتتاح عمل میں آیا ہے۔ یہ مسجد جس شہر میں ہے اس کا نام "شاہ علام" ہے۔

مسجد کے افتتاح کے وقت شہنشاہ ملیشیا اور دیگر علماء و اعلیٰ عہدیداران موجود تھے۔ مسجد کا نام "مسجد السلطان صلاح الدین بن عبد العزیز شاہ" تجویز کیا گیا ہے۔ اس مسجد میں بیک وقت بیس ہزار نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے گنبد کی اونچائی اکیانوے میٹر ہے اور قطر ۵۱ میٹر ہے۔ اس میں چار بلند منارے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی لمبائی ۱۴۲ میٹر ہے۔ مؤذنین ان پر چڑھ کر اذان دیتے ہیں۔ اس کی تعمیر میں کل ۵۵ ملین ڈالر صرف ہوئے ہیں۔

بشکریہ "اخبار العالم الاسلامی" ۷ نومبر صفحہ ۲

• ترقی اردو بیورو ہند نے تقریباً اٹھارہ برس قبل اردو انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس کی ذمہ داری مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کے سپرد کی تھی جس نے یہ انسائیکلوپیڈیا بارہ جلدوں میں لکھ کر مکمل کر دی مگر بعض مشکلات کی وجہ سے اس کی طباعت میں تاخیر ہوتی رہی۔ خوشی کی بات ہے کہ اب اپریل ۱۹۸۹ء سے یہ "مخزن علوم" کے نام سے طبع ہو رہی ہے۔ آئندہ چار برس میں اس کی تمام جلدیں شائقین کے ہاتھوں میں انشاء اللہ تعالیٰ پہنچ جائیں گی۔ ہر جلد کے ۸۰۰ سے ۱۰۰۰ صفحات ہوں گے۔ پہلی چار جلدوں میں ہندوستان، اردو اور مسلمانوں سے متعلق مضامین کے علاوہ مختلف زبانوں کے ادب، فنون، قانون، تاریخ عالم، معاشیات اور حیوانیات وغیرہ پر حروف تہجی کے لحاظ سے مضامین ہوں گے۔ بقیہ آٹھ جلدوں میں مذکورۂ بالا موضوعات کے ضمن میں مختصر تحریریں شامل ہیں۔ اس میں تیرہ ہزار تحریریں ہیں جو تقریباً پانچ سو ماہرین علوم کی دیدہ ریزی کا نتیجہ ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بجائے کتابت کے نستعلیق کمپیوٹر سے کام لیا جائے گا۔

بشکریہ ماہنامہ "معارف" دسمبر، صفحہ ۴۵۱

محمد جمیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

امیر جماعت کا اساتذۂ جامعہ سے خطاب

مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند، جامعہ کی انتظامیہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے بلریا گنج تشریف لائے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اساتذہ کی خواہش پر جامعہ کے ذمہ داروں نے چائے کی نشست کا اہتمام کیا۔ مولانا ۲۰ دسمبر ۱۹۸۸ء کو جامعہ کے ہال میں تشریف لائے۔ مولانا دن بدن کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک تو عمر کا تقاضا ہے دوسرے دن رات کی تحریکی مصروفیات نے نڈھال کر کے رکھ دیا ہے۔ چائے کے بعد صدر جامعہ مولانا عبد الحسیب صاحب اصلاحی کی درخواست پر امیر جماعت نے ایک مختصر لیکن نہایت پر اثر خطاب فرمایا۔ مولانا اپنی چھڑی کا سہارا لئے کرسی پر بیٹھے تھے اور اپنے مخصوص انداز میں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرما رہے تھے۔ مولانا نے فرمایا "خود میری خواہش آپ سے ملاقات کی تھی لیکن کل جب کہ میری روانگی ہونے والی ہے، آج ایسا ممکن ہو سکا۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے میرے لئے وقت فارغ کیا۔"

مولانا کی گفتگو جاری تھی۔ مولانا کہہ رہے تھے "ملک و ملت کو گوناگوں مسائل درپیش ہیں۔ مختلف ادارے کام کر رہے ہیں اور مختلف تحریکات سرگرم عمل ہیں۔ کسی کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سب اپنی اپنی جگہ ان مسائل کو حل کرنے اور مشکلات سے نمٹنے کے لئے قابل قدر کوششیں کر رہے ہیں لیکن جہاں تک دینی درسگاہوں کا تعلق ہے، واقعہ ہے کہ یہ درسگاہیں انتہائی گرانقدر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ باطل کے سیلاب کے آگے ان کی حیثیت چٹان کی سی ہے اور ان کی مساعی سب سے زیادہ لائق تحسین، قابل قدر، نتیجہ خیز اور مفید ہیں۔" آپ نے حاضرین کی توجہ ملک کے حالات کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا: "اس وقت کیسی کیسی تحریکات آپ کے ملی تشخص کو ختم کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں اور ان کے

اور بھیانک اثرات مذہب و ملت پر مرتب ہو رہے ہیں۔ اگر ان کا بروقت تدارک نہ کیا گیا تو پھر ہو سکتا ہے تو نہیں معلوم آئندہ نسلیں دین سے رشتہ قائم رکھ سکیں گی بھی یا نہیں۔ یہ انہی درسگاہوں کا ہی فیض ہے کہ ملت کا رشتہ دین سے باقی ہے اور آئندہ انہی سے امید بھی بندھ سکتی ہے۔"

درمیان میں اسکولوں اور کالجوں کا بھی تذکرہ آیا اور مولانا نے ان کے قیام کو بھی ضروری قرار دیا اور کہا ان کے بھی فائدے ہیں اور مختلف میدانوں میں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہاں فائدہ کی نوعیت مختلف ہے لیکن دینی درسگاہیں اس ملک میں دین و ملت کی بقا کے لئے ایسی ہی ہیں جیسے مضبوط و مستحکم قلعے۔ اگر یہ درسگاہیں آج نہ ہوتیں تو اس ملک میں بھی اس ملت کا وہی حشر ہوتا جو اسپین و قرطبہ میں ہو چکا ہے۔ ان درسگاہوں میں جامعۃ الفلاح کا ایک امتیازی مقام ہے۔ پہلے ہی دن سے اس کے اغراض و مقاصد میں ان سب باتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو ضروری ہیں، جن سے ان خطروں کا سدباب کیا جا سکے۔ حالات حاضرہ سے واقفیت ہو سکے اور فقہی اختلافات اپنی جائز حدود کے اندر رہیں۔ آپ اتنے عظیم مقاصد کی حامل ایک بڑی درسگاہ کے اساتذہ ہیں۔ آپ کی کوشش ہونی چاہئے کہ یہاں ایسا ماحول ہو جس میں باہمی اعتماد، حسن ظن، محبت، بھائی چارہ، اور ایثار و قربانی کی فضا ہو اور ایسا معاشرہ وجود میں آئے جس میں سب مل کر، قدم سے قدم ملا کر دین کی خدمت انجام دے سکیں۔ آپ کو اس پہلو سے ہمیشہ اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔ رضائے الٰہی اور فوز آخرت، یہ وہ بنیادیں ہیں جن سے آپ کی نظر ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ہٹے۔ آپ اپنے کاندھوں پر ایک عظیم خدمت کا بار اٹھائے ہوئے ہیں۔ آپ کے سپرد جو ذمہ داریاں ہیں، آپ کو دیکھتے رہنا چاہئے کہ ان میں کسی پہلو سے کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے۔ یہ دیکھئے! آپ کی کوشش ہونی چاہئے کہ تعلقات خوشگوار ہوں، تلخیاں دور رہیں، اگر کبھی کوئی بات ہو بھی جائے تو پہلی فرصت میں ختم کرنے کی کوشش کیجئے، نگاہیں فرائض پر جمی رہیں، اور فرائض ٹھیک طریقے سے ادا ہوں۔ یاد رکھئے! ملت کا مستقبل یہ طلبہ ہیں اور طلبہ کا مستقبل آپ سے وابستہ ہے۔ یہی کل ملت کے رہنما بننے والے اور آپ کی جگہ لینے والے ہیں۔ اللہ ہم سب کو توفیق خیر

دست کر تو لتعلق و ذمہ داریوں کا صحیح شعور پیدا ہو اور ان سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ، ہمت اور طاقت بخشے۔

تقریر ختم ہو چکی تھی۔ سوال و جواب کا سلسلہ تھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ "بے نظیر زرداری کی جمہوریت کے مقابلے میں ضیاء الحق کی آمریت بہتر تھی" راقم نے چاہا کہ اس سلسلہ میں مولانا کا نقطۂ نظر معلوم کرے لیکن پاکستان کا لفظ آتے ہی مولانا بول پڑے "ارے میاں جانے دو تمہارے اپنے مسائل کم ہیں کیا۔۔ آج بہت سارے مسائل اور ناخوشگواریوں کی جڑ یہی ہے کہ لوگ صرف دوسروں کو دیکھتے اور دوسروں کے مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر انسان اپنے اوپر نگاہ ڈالنے لگے اور اپنی ذمہ داریوں پر نظر رکھے تو بے شمار مسائل پیدا ہی نہ ہوں اور خواہ مخواہ کی غلط فہمیاں راہ نہ پائیں۔" سوال ادھورا ہی رہ گیا اور ایک صاحب نے ایک دوسرا سوال کیا:

"مولانا! کیا بات ہے سات آٹھ سال طلبہ ہمارے درمیان رہتے ہیں لیکن یہاں سے دوسرے اداروں میں جاکر وہاں کا اثر بہت جلد قبول کر لیتے ہیں اور اپنی خو بو بھول جاتے ہیں؟"

امیر جماعت نے جواب دیا: "آپ کو غور کرنا چاہئے کہ آپ کی تعلیم و تربیت میں کوئی نقص تو نہیں رہ گیا ہے کہ وہاں جاکر غلط ماحول کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ کی طرف سے لازماً کوتاہی ہوئی ہو۔ اس کا عین امکان ہے کہ آپ نے تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو اور آپ کی کوششیں ٹھیک رخ پر رہی ہوں لیکن پھر بھی وہاں جاکر اثرات قبول کر لیں۔ بہر صورت اس بگاڑ کی ذمہ داری آپ اساتذہ پر ہی نہیں ہے پھر بھی آپ کو دیکھنا چاہئے کہ شاید تربیت میں کوئی کمی تو نہیں۔"

سائل کو مخاطب کرتے ہوئے آپ نے کہا: "بحیثیت مجموعی آپ کی بات صحیح نہیں ہے جہاں تک جامعۃ الفلاح کا تعلق ہے تو میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ جامعہ کے طلبہ دیگر درسگاہوں کے مقابلے میں اس درجہ متاثر نہیں ہوتے ہیں جتنے دیگر درسگاہوں کے طلبہ متاثر ہوتے ہیں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ جو طلبہ فارغ ہو رہے ہیں ان سے بے تعلق نہ ہوں، ان سے ربط رکھیں۔"

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کی طرف، جو اس سلسلہ میں کافی فعال ہے اور فارغین سے مسلسل ربط رکھنے کی کوشش کر رہی ہے، اشارہ کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ "اسی مقصد کے لئے آپ کے فارغین کی ایک تنظیم ہے جو اس سلسلہ میں کام کر رہی ہے۔ اور بھی بعض طلبہ تنظیمیں اس سلسلہ میں کام کرتی رہتی ہیں۔ ایس۔ آئی۔ ایم بھی کام کر رہی ہے لیکن جماعت نے کام کی وسعت اور ہمہ گیری کی بنا پر اس کو ناکافی سمجھ کر ایس۔ آئی۔ او قائم کی جو اس سلسلہ میں پیش رفت کر رہی ہے۔ ایک تو طلبہ کا شعور پختہ نہیں ہوتا دوسرے غیر مسلم تو غیر مسلم، مسلمانوں پر بھی مادیت پرستی کا رنگ غالب ہے۔ باہر جانے کی راہ کھل جانے کے نتیجے میں اس میں اور اضافہ ہی ہو گیا ہے اس لئے مسلسل نگہداشت اور ربط کی ضرورت ہے لیکن مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ دینی تعلیم بے اثر نہیں ہو سکتی۔ وقتی طور پر طلبہ متاثر ہو سکتے ہیں لیکن دیر سویر دینی تعلیم اپنا رنگ دکھائے گی اور اس کا اثر ضرور ہوگا۔ آپ لوگوں کو مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔"

ایک نوجوان نے بالکل آخری مرحلے میں بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے دو دھڑوں میں بٹ جانے کا تذکرہ کیا اور مولانا کے خیالات معلوم کرنے چاہے۔ مولانا نے افسوس کے ساتھ فرمایا "یہ پستی کی بات ہے۔ دعا کرو مسلمانوں کے اختلافات ختم ہو سکیں۔"

اور بھی بعض سوالات کئے گئے جن کا جواب مولانا نے دیا۔ آخر میں صدر جامعہ نے محترم امیر جماعت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "مولانا نے جن قیمتی مشوروں سے نوازا ہے اور جو گرانقدر نصیحتیں فرمائی ہیں ہم مولانا سے درخواست کرتے ہیں کہ مولانا دعا کریں کہ ہم ان پر عمل پیرا ہو سکیں اور جن مقاصد کے تحت درسگاہ قائم ہوئی ہے وہ پورے ہوں اور یہ درسگاہ دین و ملت کے لئے بیش از بیش خدمت انجام دے سکے۔"

طلبہ کی شدید خواہش تھی کہ محترم امیر جماعت ان کے لئے بھی وقت نکالیں لیکن وقت کی کمی اور صحت کی کمزوری حائل رہی اور یہ ممکن نہ ہو سکا۔

دو اساتذہ اپنے دوروں سے واپس

استاذ محترم مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی ۳۰ نومبر ۱۹۸۸ء کو اور محترم جناب قاری فرقان احمد صاحب ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء کو اپنے دوروں سے واپس تشریف

سے آئے۔ ان دوروں کے مقاصد میں تفریح بھی ہے، زیارت اور بعد دوران متعلقین جامعہ سے ملاقات ان کے حالات سے واقفیت اور دوسرے مدارس اور جامعات سے تعارف اور روابط پیدا کرنا بھی پیش نظر تھا اور اب یہ حضرات واپسی کے بعد اپنی اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مصروف ہو چکے ہیں۔

جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیاں

امسال دوران جمعیت نے سالانہ امتحانات سے کافی پہلے انعامی مقابلے کرانا شروع کر دیئے ہیں۔ انھوں نے بہت اچھا کیا۔ امتحان کے زمانہ میں پڑھائی زوروں پر ہوا کرتی ہے اور ان دنوں مقابلے سے امتحان کی تیاری پر کافی اثر پڑتا تھا۔ ایک اور خوش آئند پہلو یہ ہے کہ ہفتہ وار پروگرام حسب معمول چل رہے ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نیز یہ کہ ان پروگراموں میں انعامی حصہ لینے کی اجازت دی گئی ہے جو سال کے بقیہ دنوں میں ہفتہ وار پروگراموں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ ان مقابلوں کی افادیت اور ضرورت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن پروگراموں کی ترتیب اور ان کی تیاری میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ اس کے پیش نظر اگر اختتام سال سے پہلے عنوانات اور تفصیلات کا اعلان کر دیا جائے اور سال کی ابتدا میں جبکہ تعلیم کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے مقابلے کرائے جائیں تو اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو تیاری کے لئے کافی وقت مل جائے گا۔ دوسرے تعلیم بھی متاثر نہیں ہو گی۔ اب تک ہونے والے مقابلوں کی تفصیلات یہ ہیں:

مقابلہ قرأت و تجوید

عربی مدارس میں تجوید کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی ہے ایک طالب علم فارغ ہو جاتا ہے لیکن وہ قرآن صحیح طریقے سے نہیں پڑھ پاتا، نہ تلفظ ٹھیک سے ادا کر پاتا ہے اور نہ مخارج درست ہوتے ہیں۔ جامعۃ الفلاح نے اس طرف توجہ دی ہے اور نہ صرف درجہ حفظ میں تجوید پر زور دیا جاتا ہے بلکہ عربی اول و دوم میں بھی اس کی گھنٹیاں رکھی گئی ہیں۔ اس سے الگ ہٹ کر اونچے درجے کے طلبہ کے مختلف گروپ ہیں جو تجوید سیکھتے اور سکھاتے رہتے ہیں۔ اس ذوق میں مہمیز لگانے کے لئے طلبہ کی جمعیت تجوید کا مقابلہ بھی کراتی ہے۔ اس میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والوں کی تفصیلات یہ ہیں:

عربی پنجم تا ہفتم	I	محمد سعد نیپالی عربی ہفتم
" "	II	محی الدین نیپالی عربی ہفتم
" "	III	عبدالمالک گونڈوی عربی پنجم
عربی اول تا چہارم	I	جاوید سلطان اعظمی عربی چہارم
" "	II	فضل الرحمٰن نیپالی " اول
" "	III	سراج الدین " چہارم
درجہ حفظ	I	نعمان انور اعظمی
" "	II	سیف اللہ مجاہد بھاگلپوری اور محمد ارشد اعظمی
" "	III	وسیم احمد اعظمی

مقابلہ بیت بازی

بیت بازی کے مقابلے تفریح طبع اور وقت گزاری کے لئے یہاں نہیں ہوتے۔ جمعیت اس سے بھی فائدے حاصل کرنا چاہتی ہے اس سے طلبہ کے اندر ادبی ذوق پروان چڑھتا ہے۔ آج کل ادب کو بے ادب کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ ادب عریانیت و فحاشی کا نام نہیں ہے۔ جمعیت کی کوشش ہے کہ طلبہ کے اس ذوق لطیف میں مزید جلا اور نکھار آئے اور انھیں پایہ کے شعراء کے معیاری اشعار یاد ہوں۔ یہ بیت بازی کے مقابلے آدمی کی اپنی تصویر نمایاں کرتے ہیں۔ انسان اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق اشعار یاد کرتا ہے۔ اس کے انتخاب کردہ اشعار در اصل اس کی سیرت کے عکاس اور آئینہ دار ہوتے ہیں۔ امسال طلبہ نے اچھے ذوق کا مظاہرہ کیا اور بہت ہی معیاری، مستحسن، پاکیزہ اور مقصدی اشعار سنائے۔ نمایاں طلبہ یہ تھے:

عربی پنجم تا ہفتم	I	شمشاد عالم سعودی عربی ہفتم اور عبدالحلیم بستوی عربی ششم
" "	II	عرفان احمد بجنوری عربی ششم اور شاہد اعظمی عربی پنجم
" "	III	محمد یسین احمد آبادی عربی پنجم اور رضوان الحق گورکھپوری عربی ہفتم
عربی اول تا چہارم	I	رئیس احمد آزادی عربی سوم
" "	II	سراج الدین بستوی " اول

عربی اول تا چہارم	III	فیاض احمد دربھنگہ عربی چہارم
درجہ دوم تا پنجم	I	نیاز احمد اعظمی
" " "	II	اختر خان سنبھلی
" " "	III	مشیر حسین سنبھلی

بقیہ مقابلوں کی تفصیلات اگلے شمارے میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

انتظامیہ کا اجلاس

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق جامعہ کی انتظامیہ کا اجلاس ۱۸ اور ۱۹ دسمبر ۱۹۸۸ کو جامعہ میں چلتا رہا۔ چونکہ جامعہ کے پاس اس طرح کے پروگرام کے لئے کوئی ہال نہیں ہے اس لئے اجلاس کی کارروائیاں جامعہ کے کتب خانہ میں ہوئیں۔ پچھلی انتظامیہ کے نئے منتخب کردہ درج ذیل ممبران ڈاکٹر عبید اللہ فراہی لکھنؤ، ڈاکٹر فخر الاسلام اصلاحی اعظم گڑھ، ڈاکٹر ابو محمد بلریا گنج، ڈاکٹر داؤد بلریا گنج، ڈاکٹر علاء الدین بلریا گنج اجلاس میں شریک رہے۔ ایڈیٹر "الدعوۃ" مولانا اسحاق ندوی دہلی اور جناب خورشید صاحب نصیر پور شریک اجلاس نہیں ہو سکے۔

شوریٰ کا اجلاس

انجمن طلبۂ قدیم کی شوریٰ کا اجلاس ۲۰ دسمبر ۱۹۸۸ء کو ہونا طے تھا۔ اجلاس وقت پر شروع ہوا۔ اس میں جہاں دوسرے امور زیر بحث آئے وہیں "حیات نو" اور انجمن کے دستور میں ترمیمی سفارشات پر خاص طریقے سے شوریٰ کے افراد نے غور کیا اور بعض مناسب فیصلے کئے جن کی مختصر رپورٹ آپ اسی شمارہ میں سکریٹری انجمن کے قلم سے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ صدر انجمن نسیم احمد غازی، رکن شوریٰ شبیر احمد فلاحی اور مقبول احمد فلاحی اس موقع پر کئی روز جامعہ میں رہے اور مختلف معاملات میں حصہ لیتے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔

انجمن کی طرف سے ہدیہ

انجمن کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہے کہ طلبہ کی زندگی میں کتابوں کی کیا اہمیت ہے اس لئے ہمیشہ اپنی بساط بھر یہ کوشش کی ہے کہ کتابوں کے معاملہ میں طلبہ و طالبات دونوں کو خود کفیل کر دیا جائے چنانچہ ابھی حال ہی میں دونوں کی لائبریریوں کے پیش نظر چار سو بیس اہم اور مفید کتابیں انجمن نے خریدی ہیں جو جامعہ آچکی ہیں۔ جلد ہی ان کے ذمہ داروں کے حوالے یہ کتابیں کر دی جائیں گی۔